36/16/37

جنوری ۱۹۹۷ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

- عہدِ حاضر میں اجتہاد — اہمیت اور شرائط اہلیت
ڈاکٹر اسرار احمد
- روزے کی عبادت — حکمت اور مقاصد
عمران نذر حسین

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی

سکول و کالج کے اساتذہ کے لئے

ماہ رمضان میں دورۂ ترجمہ قرآن

سے استفادے کا بہترین موقع

سکولوں اور کالجوں میں عربی اور اسلامیات کے ایسے اساتذہ کو جو ان مضامین میں ماسٹرڈگری یا اس کے مساوی تعلیمی استعداد کے حامل ہوں' مرکزی انجمن خدام القرآن کی جانب سے یہ پیشکش ہے کہ وہ ماہ رمضان کی راتوں میں نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام میں اگر شرکت کرنا چاہیں تو انہیں قیام و طعام کی سہولت انجمن کی جانب سے فراہم کی جائے گی۔ پاکستان کے درج ذیل چار شہروں میں مذکورہ سہولت مہیا کی گئی ہے۔

☆ لاہور : قرآن اکیڈمی' 36۔کے' ماڈل ٹاؤن' فون:03-5869501

☆ کراچی : قرآن اکیڈمی' DM-55 خیابان راحت' درخشاں فیز6 ڈیفنس

فون : 5855219'5854036

☆ ملتان : قرآن اکیڈمی' 25۔ آفیسرز کالونی۔ فون : 521070

☆ ٹوبہ ٹیک سنگھ : الہدیٰ انٹرپرائز' سٹی پلازہ' تالاب بازار

(ٹوبہ میں یہ پروگرام پنجابی زبان میں ہوگا)

نوٹ : اس بابرکت پروگرام میں شرکت کے خواہشمند حضرات جلد از جلد مذکورہ مراکز میں سے کسی ایک سے رابطہ فرمائیں۔ اس پروگرام میں دلچسپی رکھنے والے دیگر حضرات بھی قیام و طعام کے اخراجات ادا کر کے اس سہولت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

المعلن : ناظم اعلیٰ' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 3-5869501

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اُوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد : ۴۶
شمارہ : ۱
رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ
جنوری ۱۹۹۷ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرِ تعاون ۱۰۵/-

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات، قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ 22 امریکی ڈالر

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت : 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور54700۔فون : 03۔02۔5869501
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی : 67۔ گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون : 6305110
پبلشر : ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع : رشید احمد چودھری، مطبع : مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ عرض احوال ______ ۳

حافظ عاکف سعید

☆ تذکرہ و تبصرہ ______ ۵

عہد حاضر میں اجتہاد۔ اہمیت اور شرائط اہلیت

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ استقبال رمضان ______ ۲۹

روزے کی عبادت۔ حکمت اور مقاصد

عمران این حسین

نیکیوں کا موسم بہار ______ ۳۹

مولانا محمد یوسف اصلاحی

☆ ہماری دعوت ______ ۴۵

عبادت رب

رحمت اللہ بٹر

☆ بحث و نظر ______ ۶۰

جہاد کشمیر کی حقیقت

انجینئر نوید احمد

☆ افکار و آراء ______ ۶۹

حقانی صاحب! اپنی ذمہ داریاں ادا کریں — محبوب الحق عاجز

اطلاع برائے قارئین: آسان عربی گرامر، حصہ سوم چھپ کر آگئی ہے اور مکتبہ مرکزی انجمن سے حاصل کی جا سکتی ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

ماہ رمضان المبارک کی آمد آمد ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خطبہ مبارکہ کے الفاظ: "یاایھا الناس قد اظلکم شھر عظیم" کے مطابق فی الواقع عظمتوں اور برکتوں کا حامل مہینہ سایہ فگن ہو چکا ہے۔ اس ماہ مبارک میں وہ عظیم شب بھی شامل ہے جو ہزار مہینوں پر بھاری ہے کہ اس ایک رات کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے افضل ہے۔ شب قدر کے بارے میں عام خیال یہی ہے جس کی تائید بعض صحیح روایات سے بھی ہوتی ہے کہ ماہ رمضان کی ستائیسویں شب ہی دراصل شب قدر ہے۔ بعض روایات میں ماہ رمضان کے آخری عشرے کی دیگر طاق راتوں کا ذکر بھی ملتا ہے' واللہ اعلم۔ بہرکیف کوئی اسے حسن اتفاق کہے یا کچھ اور' ہمارے نزدیک یہ تدبیر الٰہی کا مظہر ہے کہ پاکستان کا قیام ماہ رمضان کی ۲۷ تاریخ کو عمل میں آیا تھا۔ گویا رواں ماہ رمضان کی ۲۷ تاریخ کو پاکستان اپنی عمر کے اکاون برس مکمل کرلے گا۔

پاکستان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ پوری دنیا میں یہ واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر وجود میں آیا۔ تاہم یہ عظیم المیہ ہے کہ اسلام کے نام پر دنیا کے نقشے پر ابھرنے والی یہ عظیم اسلامی ریاست نصف صدی گزرنے کے بعد بھی بے یقینی کی انتہائی کیفیت سے دوچار اور عدم استحکام کا عبرتناک نمونہ بنی ہوئی ہے۔ اس پچاس سالہ عرصے میں پاکستان کا ایک بازو کٹ کر جدا ہو چکا ہے اور بقیہ پاکستان مسلسل سیاسی اور اقتصادی بحرانوں کے نرغے میں رہا اور اگر حالات میں کوئی بڑی مثبت تبدیلی نہ آئی تو اس بچے کھچے پاکستان کی سالمیت بھی مشکوک نظر آتی ہے۔ تنظیم اسلامی اور اس کے امیر کا مستقل موقف یہ ہے کہ پاکستان کا استحکام ہی نہیں اس کی بقا بھی اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہمارے عدم استحکام کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم من حیث القوم' اللہ اور اس کے دین کے ساتھ غداری کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ہم نے گزشتہ پچاس برسوں کے دوران نفاذ اسلام یعنی نظام خلافت کے قیام کی جانب کوئی حقیقی پیش قدمی کرنے کی بجائے اپنا پورا زور انگریز کے چھوڑے ہوئے باطل نظام کی حفاظت میں صرف کیا ہے۔ وہی جاگیرداری نظام' وہی سودی معیشت جو قیام پاکستان سے پہلے رائج تھی' آج بھی قائم و دائم ہے' بلکہ ہم نے اس طاغوتی نظام کو مزید پختہ کیا ہے اور اگر کوئی پیش رفت کی ہے تو اسی رخ پر۔ آج ساری دنیا ہمیں سیاسی طور پر نابالغ اور معاشی طور پر بدحال اور کشکول بدست قوم کی حیثیت سے جانتی ہے۔ اس پر اس سلور میڈل کا مزید اضافہ کر لیجئے جس کا "اعزاز" ہمیں اقوام عالم میں حال ہی میں کرپشن اور بددیانتی کے معاملے میں "دوسری پوزیشن" حاصل کرنے پر بخشا گیا ہے۔

گزشتہ ماہ تحریک خلافت پاکستان کے زیر اہتمام سقوط مشرقی پاکستان کے موضوع پر منعقدہ ایک تقریب میں ایک معروف صحافی نے جن کا شمار کوچہ صحافت کے اہل دانش میں ہوتا ہے' اپنی تقریر میں اس رائے کا اظہار کیا کہ "پاکستان اسلام کے لئے نہیں بلکہ محض مسلمانوں کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ پاکستان کا

قیام کسی اعلیٰ تر مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ نہیں تھا بلکہ پاکستان کا قیام ہی ہماری آخری منزل تھا اور ۱۴/ اگست ۴۷ء کو ہم نے اپنی منزل کو پالیا۔ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام یا پائن اسلام ازم کو تحریک پاکستان کے معاملے میں اپنی منزل قرار دینا خلط مبحث کے مترادف ہے"۔ ہم فاضل مقرر کی صاف گوئی پر تو انہیں داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے اپنے دل کی بات کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر واضح انداز میں شرکاء مجلس کے سامنے رکھی لیکن ان سے یہ سوال کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ اگر پاکستان بجائے خود ایک منزل تھا تو یہ مقصد حاصل ہو جانے کے بعد اور اچھا ٹیلنٹ رکھنے کے باوجود آج ہم ہر اعتبار سے اتنے زبوں حال کیوں ہیں؟--- کیا پاکستانی قوم کو پیدائشی طور پر ذہنی مریض یا ذہنی طور پر معذور سمجھا جائے کہ ہم آج پچاس سال گزرنے کے بعد بھی سیاسی شعور اور معاشی خود کفالت کے میدان میں دنیا کی تمام دوسری اقوام یہاں تک کہ ہندو قوم سے بھی بہت پیچھے ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ آج یہ شعر صد فی صد ہم پر صادق آتا ہے کہ ؎

ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے
ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ

کیا وجہ ہے کہ ملکی سطح پر ہمارا ہر ادارہ آج تباہی کے آخری دہانے تک پہنچا ہوا ہے؟ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے اور حامل قرآن ہونے کے باوجود کیا وجہ ہے کہ اخلاق و کردار کے اعتبار سے ہم گراوٹ کی آخری انتہاؤں کو چھو رہے ہیں؟

امیر تنظیم اسلامی کی تشخیص بالکل صاف اور واضح ہے کہ ہم اللہ سے کئے گئے اس عہد کی خلاف ورزی کی سزا بھگت رہے ہیں جو ہم نے قیام پاکستان کے وقت اللہ سے کیا تھا کہ ہم "پاکستان کو اسلام کے اصول حریت و اخوت و مساوات کا ایک مثالی نمونہ بنائیں گے" اور "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ"۔ اس عہد شکنی کی پاداش میں اس سنت اللہ کے مطابق جس کا ذکر سورۂ توبہ کی آیات ۷۵ تا ۷۷ میں وارد ہوا ہے' نفاق عملی کا روگ ہمارے جسد ملی کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکا ہے۔ اور اس صورتحال کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم پاکستان میں اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے قیام یعنی نظام خلافت کے احیاء و قیام کے لئے کمربستہ ہو جائیں اور اس ضمن میں کسی حقیقی پیش رفت کا آغاز کر دیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ کام جب تک ایک قابل ذکر پیمانے پر نہیں ہو گا اور نمایاں دینی قوتیں جب تک جمع ہو کر اس کے لئے سنجیدہ اور مخلصانہ کوشش نہیں کریں گی' بات آگے نہیں بڑھے گی۔ بہرکیف اصلاح احوال کا واحد فوری راستہ اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ دینی قوتیں حالات کی نزاکت اور اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے انتخابی سیاست کے میدان سے کنارہ کش ہو کر اور سیرت طیبہ سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے انقلابی طریق کار کو اپنا کر نظام خلافت کے قیام کے لئے بھرپور متحدہ کوشش کا آغاز کر دیں۔ بصورت دیگر قوم کی حالت سدھرنے کا کوئی امکان دور دور تک نظر نہیں آتا۔

عہدِ حاضر میں اجتہاد

اہمیّت اور شرائطِ اہلیّت

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ۵/ جنوری ۹۶ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ' سورۃ الحجرات کی پہلی آیت' سورۃ النساء کی آیت ۵۹ اور سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۸ کی تلاوت اور دو احادیث مبارکہ کا متن بیان کرنے کے بعد فرمایا :

آج مجھے "عہدِ حاضر میں اجتہاد" کے موضوع پر تفصیل سے گفتگو کرنی ہے۔ یعنی عہدِ حاضر میں اجتہاد کی اہمیت کیا ہے؟ اس کی نوعیت اور اس کی صورت کیا ہوگی اور اس کا طریق کار کیا ہوگا؟

اجتہاد کے بارے میں سب سے پہلے تو ہمیں یہ جاننا چاہئے کہ اس کے لفظی معنی کیا ہیں؟ ہمارے سامعین اور قارئین کی عظیم اکثریت اس سے واقف ہے کہ عربی زبان کے اکثر و بیشتر الفاظ کا ایک سہ حرفی مادہ ہوتا ہے اور اس مادہ سے پھر الفاظ مختلف پیمانوں پر مختلف سانچوں میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً لفظ "علم" ہی کو لیجئے' اس سے عالِم بھی ہے' معلوم بھی ہے' متعلّم بھی ہے' معلِّم بھی ہے' علامت بھی ہے' استعلام بھی ہے۔ اسی طرح اجتہاد کا مادہ "جہد" ہے۔ اس پر متعدد مرتبہ گفتگو ہو چکی ہے کہ اسی مادے سے جہاد اور مجاہدہ کا لفظ بنا ہے۔ اس وقت صرف یہ نوٹ کر لیجئے کہ جُہد کے معنی کوشش کے ہیں۔ یہ گویا ایک مثبت اور یکطرفہ عمل ہے۔ آپ کسی کام کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن جب اس کوشش میں آپ کو کوئی مقابلہ پیش آجائے' کوئی رکاوٹ پیش آجائے' درمیان میں کوئی ایسی مشکل آن پڑے کہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے جس سے نمٹنا ضروری ہو تو اب یہ جہاد بن جائے گا۔ جہد کا جہد سے مقابلہ ہوگا' تو یہ جہاد یا مجاہدہ ہے۔ اجتہاد اسی مادہ

سے باب افتعال ہے۔ گویا کہ خود جُہد کرنے والے کا اپنے اوپر شدید مشقت جھیلنا۔ باب افتعال کا خاصہ یہ ہے کہ کسی کام کو اپنے اوپر لینا۔ مثلاً التزام کا مفہوم ہو گا خود کسی شے کو لازم پکڑ لینا۔ اسی طرح اپنے اوپر شدید ترین مشقت جھیلنا لفظ "اجتہاد" کا مفہوم ہے۔

اجتہاد کا اصطلاحی مفہوم

اجتہاد کے اصطلاحی معنی سمجھنے کے لئے ہم حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں، جسے امام ترمذیؒ نے بھی روایت کیا ہے اور امام احمد بن حنبلؒ نے بھی۔ اس حدیث سے یہ بات اجاگر ہو جائے گی کہ اصطلاح میں اجتہاد کا مطلب کیا ہے۔

آپ کے علم میں ہو گا کہ حضرت معاذؓ بن جبل ان چند صحابہؓ میں سے ہیں جن کی مدح میں رسول اللہ ﷺ نے افعل التفضیل کا صیغہ (Superlative Degree) استعمال کیا ہے۔ آپ خطباتِ جمعہ میں اکثر یہ الفاظ سنتے ہیں : "اَرحَمُ اُمّتی بِاُمّتی ابوبکر، وَاَشدُّھم فی امرِاللّٰہ عمر، وَاَکثَرھم حیاءً عثمان، وَاَقضاھُم علیّ" (رضی اللّٰہ تعالٰی عنھم وارضاھم اجمعین)--- یہ چاروں افعل التفضیل کے صیغے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "میری اُمت میں سے امت پر سب سے زیادہ رحیم و شفیق ابو بکر صدیقؓ ہیں۔ میری امّت میں اللہ کے معاملے میں سب سے زیادہ سخت عمرؓ ہیں۔ میری امت میں سب سے بڑھ کر باحیاء عثمانؓ ہیں۔ میری امت میں صحیح ترین فیصلے کی سب سے زیادہ صلاحیت علی میں ہے"۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ اسی طریقے سے حضرت معاذ بن جبلؓ کے بارے میں حضور ﷺ کے الفاظ ملتے ہیں : "اَعلَمُھم بِالحلالِ وَالحرامِ مُعاذُ بنُ جَبل" یعنی حلال اور حرام کی معرفت اور پہچان میں سب سے بڑا ملکہ اللہ نے میرے اس صحابی معاذ بن جبل کو عطا کیا ہے۔ یعنی جس کو ہم قانونی شعور (Legal Sense) کہتے ہیں وہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سب سے بڑھ کر ان میں تھی۔ یہ بڑا قانونی مسئلہ ہے کہ ایک شے حلال ہے یا حرام۔ اور بہت سی جگہوں پر جا کر ان کے مابین بڑی باریک سی سرحد آجاتی ہے اور حلال و حرام کا

تعین بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ جیسے ایک حدیث میں بھی آیا ہے کہ "الحلالُ بیّنٌ وَ الحَرامُ بیّن وبینھما مُشتَبِھاتٌ" یعنی کچھ حلال تو وہ ہیں جو بالکل واضح طور پر حلال ہیں۔ اسی طرح کچھ حرام وہ ہیں جو بالکل واضح طور پر حرام ہیں' لیکن بیچ میں کچھ مشتبہات بھی ہیں' جن کو پہچاننا اور ان کے بارے میں تعین کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے کہ آیا یہ حلال ہیں یا حرام۔ اور یہ معاملہ اس قدر نازک ہے کہ کسی حرام چیز کو حلال قرار دے دینا یا کسی حلال چیز کو حرام بنا دینا دونوں برابر کے جرم ہیں۔ چنانچہ اس معاملے میں بڑے گہرے شعور اور فہم کی ضرورت ہے' بڑے علم کی ضرورت ہے' معلومات کی ضرورت ہے۔ تب کہیں کسی شخص کو اس معاملے میں خصوصی طور پر کوئی مقام حاصل ہو گا۔ تو حضور ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا خاص اس پہلو سے تذکرہ فرمایا۔

یہ حدیث بھی دراصل اسی ضمن میں ہے۔ اجتہاد کا تعلق بھی اسلام کے قانونی نظام ہی سے ہے۔ اب ہم اجتہاد کے بارے میں حضرت معاذ بن جبل سے مروی اس حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں : ((عن مُعاذِ بنِ جَبل (رضی اللہ عنہ) انَّ رسولَ اللّٰہ ﷺ بعَث معاذاً الیَ الیَمن' فقال : کیف تقضی؟ قال : اَقضِی بما فی کتابِ اللّٰہ۔ قال : فَاِن لم یَکُنْ فی کتابِ اللّٰہِ؟ قال : فبِسُنّةِ رسولِ اللّٰہ ﷺ ۔ قال : ان لم یکن فی سُنّةِ رسولِ اللہ؟ قال : اَجتَھِدُ رَأیِی ۔ قال : الحَمدُلِلّٰہِ الذی وفّق رسولَ رسولِ اللّٰہ لما یحبُّ ویرضٰی))

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ خود بیان کر رہے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے یمن کی طرف بھیجا۔ بھیجنے سے یہاں مراد ہے والی بنا کر' عامل بنا کر' گورنر بنا کر بھیجا۔ اب روانگی سے پہلے حضور ﷺ انٹرویو لے رہے ہیں کہ میں جس شخص کو اتنی بڑی ذمہ داری دے رہا ہوں اس کے بارے میں اندازہ کر لوں کہ کوئی صحیح طریق کار اس کے علم میں ہے یا نہیں۔ چنانچہ پوچھا : "کیف تقضی؟" یعنی "تم فیصلے کیسے کرو گے؟" ظاہر ہے کہ جو شخص بھی ذمہ دار ہے' گورنر ہے' والی ہے' عامل ہے' اس کو خوب سوچ کر فیصلے کرنے ہوں گے۔ اس کے سامنے مقدمات پیش کئے جائیں گے' جھگڑے سامنے آئیں گے' ان کا

کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہے' تو پوچھا کہ فیصلے کیسے کرو گے؟۔ قال : اَقضِی بِمَا فی کتابِ اللّٰہ۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں اللہ کی کتاب میں جو کچھ پاؤں گا اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ایک بالکل سیدھی سی فطری سی بات ہے۔ حضور ﷺ نے دوسرا سوال کیا کہ اگر وہ معاملہ یا وہ مسئلہ کتاب اللہ میں مذکور نہ ہو تو کیا کرو گے؟ قال : فَبِسُنَّۃِ رسولِ اللّٰہ ﷺ انہوں نے عرض کیا کہ پھر میں اس کا حل اللہ کے رسولؐ کی سُنّت کے اندر تلاش کروں گا اور اس کے مطابق فیصلہ کرلوں گا۔ حضورؐ نے تیسرا سوال کیا کہ اگر تمہیں اللہ کے رسولؐ کی سنت میں بھی کوئی چیز نہ ملے تو پھر کیا کرو گے؟ اس پر حضرت معاذ بن جبلؓ نے عرض کیا : اَجْتَہِدُ رَأیِی۔ یعنی پھر میں امکانی حد تک کوشش کر کے اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا۔ یہاں لفظ آیا ہے "اَجْتَہِدُ" جس سے مصدر "اجتہاد" ہے۔ اور ہمارے دین کا جو تشریعی اور قانونی نظام ہے اس میں اہم ترین اصطلاح کی حیثیت اس لفظ کو حاصل ہے۔ یہ لفظ وہ ہے کہ جس کو حضرت معاذؓ نے آنحضور ﷺ کے سامنے استعمال کیا کہ اگر مجھے کوئی چیز صراحت کے ساتھ اللہ کی کتاب میں ملے نہ سنّتِ رسولؐ میں تو میں اپنی سی امکانی کوشش کروں گا' امکانی حد تک مشقت جھیلوں گا' پوری محنت کروں گا اور پھر مجھے اپنی کوئی رائے بنانی پڑے گی اور یہ معاملہ مجھے اپنی رائے سے طے کرنا ہوگا۔ "اَجْتَہِدُ رَأیِی" کے الفاظ اپنے اندر یہ وضاحت لئے ہوئے ہیں کہ میری یہ رائے کوئی سرسری سی رائے نہیں ہوگی کہ جو بھی جی میں آئے میں اس کے مطابق فیصلہ کردوں' بلکہ میری یہ رائے میری انتہائی محنت و کوشش اور مشقت کا نتیجہ ہوگی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اجتہاد کے لفظی معنی یہی ہیں کہ آپ آخری امکانی حد تک محنت اور مشقت جھیل لیں' پھر زبان کھولیں۔ حضرت معاذؓ کے جواب کی حضور ﷺ نے تصویب فرمائی اور گویا شاباش دینے کے انداز میں فرمایا : ((اَلحَمدُ لِلّٰہِ الذی وفّقَ رسولَ رسولِ اللّٰہ لما یحبُّ ویرضٰی)) کُل حمد کُل شکر اس اللہ کا ہے جس نے اللہ کے رسول کے رسول کو اس بات کی توفیق دی جس سے وہ راضی ہے اور جو اسے پسند ہے۔

یہ اس اعتبار سے بڑا پیارا مقام ہے کہ یہاں حضور ﷺ نے حضرت معاذؓ کے

لئے "رَسُوْلُ رَسُوْلِ اللّٰہ" (اللہ کے رسول کا رسول) کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ یہاں "رسول" کا جو لفظ آیا ہے وہ اپنے لفظی معنی میں ہے۔ اَرْسَلَ ... یُرْسِلُ - بھیجنا' اور رَسُوْل = فرستادہ' ایلچی' پیغامبر' نمائندہ۔ اللہ نے بھیجا ہے محمد ﷺ کو' تو اللہ کے رسول محمد ﷺ ہیں اور اب محمد ﷺ بھیج رہے ہیں اپنے ساتھی اپنے صحابی معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف' تو یہ "رسول" ہیں محمد رسول اللہ ﷺ کے۔ یہی لفظ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے خود اپنے بارے میں استعمال کیا تھا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے بڑے پیمانے پر "بیعتِ رضوان" لی تھی۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ جا کر مدینہ کی خواتین سے میری جانب سے' میرے نمائندے کی حیثیت سے بیعت لے لو۔ چنانچہ وہاں خواتین کا اجتماع منعقد کیا گیا۔ حضرت عمرؓ وہاں گئے تو جاتے ہی انہوں نے جو الفاظ کہے وہ یہ تھے : "اَنَا رَسُوْلُ رَسُوْلِ اللّٰہِ" کہ میں اللہ کے رسول ﷺ کا رسول ہوں۔ یعنی میں اللہ کے رسولؐ کا نمائندہ' آپؐ کا فرستادہ' آپؐ کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں۔

اجتہاد کے لئے ہمیشہ یہی ترتیب پیش نظر رہنی چاہئے جو حضرت معاذؓ نے بیان کی۔ یعنی سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اگر کوئی معاملہ اس میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے تو پھر کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ البتہ اگر اس میں وضاحت نہیں ہے تو پھر سنّتِ رسول ﷺ کی طرف دیکھنا ہو گا۔ پھر اگر سنّتِ رسولؐ میں بھی تعیّن کے ساتھ اس طرح کا معاملہ نہیں مل رہا تو پھر اجتہاد کرنا پڑے گا۔ اپنے اوپر پوری مشقت جھیلتے ہوئے صحیح رائے تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔

اب یہ سمجھ لیجئے کہ یہ کوشش کس معنیٰ میں ہو گی۔ ظاہر بات ہے کہ اس کوشش کے دو ہدف ہوں گے۔ مجتہد کے لئے اولاً یہ چیز پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ ایسا نہ ہو کہ میں کسی مسئلہ میں کوئی رائے ایسی دے دوں' کوئی فیصلہ ایسا دے دوں جو دین کے مجموعی نظام کے خلاف ہو۔ دین کی حیثیت ایک حیاتیاتی اکائی (Organic Whole) کی ہے۔ اس کی ایک روح ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی معاملے کے اندر میں کوئی ایسی بات کہہ بیٹھوں جو دین کے مجموعی نظام' اس کی روح' اس کے بنیادی تصورات' اس کے

Central Themes' اس کے مقاصد اور اس کی ترجیحات سے متصادم ہو جائے۔ دوسری کوشش اس اعتبار سے ہوگی کہ کہیں میری رائے کا کسی نصِّ صریح کے ساتھ ٹکراؤ نہ ہو جائے۔ یعنی یہ کہ قانونی اعتبار سے کہیں یہ رائے کتاب و سنت کی کسی بات سے متصادم نہ ہو جائے۔

اجتہاد کے ضمن میں ایک بہت اہم لفظ "قیاس" کا ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے رائے اور قیاس اصل میں مترادف ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ آپ یہ دیکھیں کہ جو بھی معاملہ آپ کے زیر غور ہے' اس سے قریب تر' ملتا جلتا کوئی معاملہ کہیں کتاب و سنت میں موجود ہو تو اس سے راہنمائی حاصل کی جائے۔ اگر کتاب و سنت میں بعینہٖ وہی معاملہ موجود ہو تا پھر تو ہمیں اجتہاد کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ تاہم اگر بعینہٖ وہی معاملہ تو قرآن میں ہے نہ سنت میں' لیکن کوئی اس سے مشابہت رکھنے والا' قریبی طور پر اس کے ساتھ کوئی تعلق رکھنے والا معاملہ قرآن یا سنت میں مل جائے تو اس سے infer کرتے ہوئے' analogy کی بنیاد پر کوئی نتیجہ نکالنا قیاس کہلاتا ہے۔

اجتہاد کے ضمن میں پانچ نقطہ ہائے نظر

اجتہاد کے ضمن میں آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اِس وقت ہمارے ہاں اس اعتبار سے پانچ مکاتبِ فکر موجود ہیں کہ دین میں ابدی اور دائمی طور پر واجب الاطاعت (binding) چیزیں کون کون سی ہیں اور کن چیزوں کی حیثیت وقتی اور عارضی تھی۔ یہ بات بہت اہم ہے۔ اس لئے کہ جو شے ابدی طور پر واجب الاطاعت ہے وہی تو اجتہاد کا ماخذ بن سکتی ہے' اسی کی بنیاد پر تو اجتہاد کیا جائے گا۔ جو چیزیں وقتی تھیں ان کی بنیاد پر تو یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پوری صورت حال کو سمجھنے کے لئے اور ذہن میں اس کا پورا نقشہ جمانے کے لئے یہ پانچ مکاتب فکر آپ کے سامنے آجانے چاہئیں۔

اس ضمن میں سب سے انتہاپسندانہ نقطۂ نظر' جو اگرچہ آپ کو بڑا مضحکہ خیز اور گمراہ کُن معلوم ہوگا' ہمارے ہاں اس طبقے کا ہے جو یہاں کا سب سے مؤثر طبقہ ہے۔ ہمارے ہاں کا جو جدید اور مغرب زدہ ذہن ہے' جو مغربی تہذیب کا دلدادہ ہے' وہ تقریباً سب کا

سب اسی نقطۂ نظر کا حامل ہے' قائل ہے' عامل ہے۔ اور وہ نقطۂ نظر یہ ہے کہ دائمی طور پر واجب الاطاعت ہونے کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے' بلکہ قرآن میں بھی جو اصول آئے ہیں وہ تو ابدی اور دائمی ہیں' ہمیشہ کے لئے واجب الاطاعت ہیں' لیکن جو معین احکام دیئے گئے ہیں وہ دائمی نہیں ہیں' بلکہ وہ صرف ایک خاص دور کے لئے تھے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن ویسے تو ابدی ہدایت نامہ ہے' لیکن چونکہ یہ ایک خاص دور میں اور خاص علاقے میں نازل ہوا ہے اور ایک خاص قوم اس کی اولین مخاطب تھی' جس کا ایک خاص تاریخی اور تہذیبی پس منظر تھا' اس کی کچھ اپنی رسومات تھیں' اس کی اپنی ایک ذہنی و فکری اور علمی سطح تھی' چنانچہ (ان کے کہنے کے مطابق) قرآن نے اصول تو وہ دیئے ہیں جو دائمی ہیں اور یہ دائمی و ابدی طور پر نوع انسانی کے لئے کتاب ہدایت ہے' لیکن اس میں جو معین احکام دیئے گئے ہیں وہ اُس دور کے حالات کے مطابق تھے اور وہ دائمی و ابدی نہیں ہیں۔ مثلاً چور کا ہاتھ کاٹنا' یہ خاص اس دور کے لئے ایک سزا تھی۔ ہاں' چوری کا انسداد ہونا چاہئے' اس کا خاتمہ ہونا چاہئے' یہ بات اپنی جگہ پر ضروری ہے۔ اسی طرح تقریباً تمام معین احکام کے معاملے میں ان کی رائے یہی ہے کہ یہ فی نفسہٖ مطلوب نہیں ہیں' یہ تو صرف اپنے خاص دور کے لئے تھے۔ ان کے نزدیک قرآن حکیم سے جو عمومی اصول اخذ کئے جا سکتے ہیں وہ دائمی ہیں۔ اس طبقے کے بارے میں' میں ایک لفظ استعمال کر رہا ہوں کہ انہیں "مسلم پروٹسٹنٹ" کہا جا سکتا ہے۔ آج سے تقریباً پانچ سو سال پہلے عالم عیسائیت میں یہ بحث شروع ہوئی تھی کہ بائبل کے بارے میں ہمارا رویّہ کیا ہونا چاہئے۔ آیا ہمیں اسے لفظ بہ لفظ خدا کا کلام اور واجب الاطاعت سمجھنا چاہئے یا اسے تمثیل' استعارہ اور محاورے کے سے انداز میں لینا چاہئے۔ جن عیسائیوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ بائبل کو لفظ بہ لفظ خدا کا کلام مانتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے واجب الاطاعت سمجھتے ہیں ان کو طعنے کے طور پر کہا گیا کہ یہ فنڈامنٹلسٹ (Fundamentalists) ہیں۔ تو یہ "فنڈامنٹلسٹ" کا لفظ وہاں سے چلا ہے جو آج بہت وسیع پیمانے پر استعمال ہو رہا ہے۔ کچھ عرصے پہلے تک تو یہ اصطلاح صرف مسلمانوں کے لئے استعمال ہو رہی تھی اور مسلم فنڈامنٹلسٹ اور اسلامک فنڈامنٹلزم کے الفاظ کو گالی کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا' اور

دنیا کو یہ ہوا دکھایا جا رہا تھا کہ "Islamic Fundamentalism on the march" لیکن اب یہ تسلیم کیا جا رہا ہے کہ فنڈامینٹلسٹ یہودیوں میں بھی موجود ہیں' عیسائیوں میں بھی' اور ہندوؤں میں بھی موجود ہیں۔ ہر جگہ موجود ہیں۔ فنڈامینٹلسٹ عیسائیوں کے برعکس پروٹسٹنٹ عیسائی بائبل کو لفظ بہ لفظ واجب الاطاعت نہیں مانتے۔ اسی طرح ہمارے ہاں جو جدید ذہن رکھنے والا طبقہ ہے' جو اپنے آپ کو ترقی پسند طبقہ کہتا ہے' وہ قرآن کے بارے میں یہی رائے رکھتا ہے کہ اس کے صرف عمومی اصول دائمی طور پر واجب الاطاعت (binding) اور ہمیشہ کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہیں' لیکن اس کے معیّن احکام ابدی نہیں ہیں۔

ان کے علاوہ ہمارے ہاں ایک دوسرا طبقہ ہے جن کے نقطۂ نظر میں پہلے طبقے کی نسبت باریک سا فرق ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ قرآن پورے کا پورا دائمی طور پر واجب الاطاعت ہے' اس کا ہر ہر لفظ مِن جانب اللہ ہے' اللہ کا کلام ہے' لیکن اس کے علاوہ کوئی اور شے دائمی طور پر واجب الاطاعت نہیں ہے۔ سنّتِ رسولؐ صرف اپنے زمانے کے لئے واجب الاطاعت تھی۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ حضور ﷺ کی دو حیثیتیں تھیں۔ آپؐ ایک طرف تو اللہ کے رسول تھے اور دوسری طرف آپؐ اُس وقت مسلمانوں کے امیر بھی تھے۔ یعنی جب تک کوئی ریاست و حکومت قائم نہیں ہوئی تھی تو آپ کہہ لیجئے کہ مسلمانوں کی جماعت "حزب اللہ" کے امیر تھے اور جب کوئی حکومت قائم ہو گئی تو آپ اس کے سربراہِ ریاست تھے۔ جب آپؐ جنگ میں جاتے تھے تو آپؐ فوج کے سپہ سالار بھی تھے۔ پھر جب آپ کوئی فیصلہ کرتے تو آپ گویا چیف جسٹس بھی تھے۔ ان کے نزدیک آنحضور ﷺ کی یہ حیثیتیں دائمی نہیں ہی' بلکہ وقتی ہیں۔ سُنّت اسی کا تو نام ہے کہ آپؐ نے کیا کیا' کیسے کیا' کس موقع پر کیا فیصلہ کیا' کسی کے لئے آپؐ نے کیا حکم دیا۔ لیکن اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ دائمی نہیں' البتہ قرآن پورے کا پورا دائمی طور پر واجب الاطاعت ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو "اہلِ قرآن" کہتے ہیں' جن کو مخالفین "منکرینِ حدیث" یا "منکرینِ سنت" کہتے ہیں۔ ان کا اپنا دعویٰ یہ ہے کہ ہم قرآن کو مانتے ہیں' اور قرآن پر ہمارا پختہ ایمان ہے کہ اس کا ایک ایک حرف مِن جانب اللہ

ہے' صحیح ہے' محفوظ ہے اور دائمی طور پر واجب الاطاعت ہے' لیکن اس کے علاوہ اور کسی چیز کو ہم قرآن پر حاکم ماننے کو تیار نہیں۔ قرآن سنّتِ رسولؐ کا محتاج نہیں ہے' یہ اپنی جگہ پر کتابِ کامل ہے' اس کو کسی اور شے کی ضرورت ہی نہیں۔ واضح رہے کہ یہ ان کا موقف ہے جو میں ان کے دلائل کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ حضورؐ کی سنت دراصل اپنے دور کے لئے تھی' کیونکہ آپؐ کو اُس دور میں "مرکزِ ملّت" کی حیثیت حاصل تھی۔ ہمارے ہاں یہ مکتبہ فکر ماضی قریب سے غلام احمد پرویز صاحب کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے' اگرچہ اس سے پہلے اس نقطۂ نظر کو پیش کرنے والے اور بھی بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں' مثلاً مولانا عبداللہ چکڑالوی (چکڑالہ شمالی پنجاب کا ایک قصبہ ہے) لیکن غلام احمد پرویز کو چونکہ لکھنے کا ڈھنگ آتا تھا' بہت اچھا اندازِ نگارش تھا' تقریر کے فن سے بھی واقف تھے' پھر چونکہ گورنمنٹ آف انڈیا میں رہے تھے اور پھر پاکستان میں بھی مرکزی حکومت میں ڈپٹی سیکرٹری رہے تھے' تو ان کا حلقہ اثر بہت وسیع تھا' چنانچہ ان کے حوالے سے یہ فکر ہمارے ہاں بہت بڑے پیمانے پر پھیلا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں آتا ہے "اَطِیعُوا اللّٰہَ وَاَطِیعُوا الرَّسُولَ" تو "اَطِیعُوا اللّٰہَ" سے مراد قرآن ہے اور "اَطِیعُوا الرَّسُولَ" سے مراد حضورؐ ہیں' لیکن آپؐ کی اطاعت صرف اُس دور کے لئے بحیثیتِ امیر جماعت' بحیثیت سپہ سالار' بحیثیت صدر مملکت تھی۔ اس کے لئے انہوں نے ایک لفظ "مرکزِ ملت" وضع کیا ہے۔ ان کے نزدیک اُس وقت مرکزِ ملّت محمد ﷺ تھے' اب اگر کبھی اسلامی ریاست قائم ہو گی تو "مرکزِ ملت" کی حیثیت اس کی حکومت کو حاصل ہو گی۔ وہ حکومت جو بھی فیصلے کرے گی وہ واجب الاطاعت ہوں گے۔

یہ نقطۂ نظر اپنے اندر ایک دامِ فریب (trap) لئے ہوئے ہے اور وہ یہ کہ اگر آپ قرآن کی تعبیرات کو سنت سے بالکل آزاد کر دیں تو آپ جدھر چاہیں الفاظ کو موڑ کر لے جائیں' اور ان کی جو چاہے تاویل کر لیں۔ قرآن مجید کی عملی تعبیر تو سنّتِ رسولؐ ہی سے سامنے آتی ہے۔ سنت رسول کے بارے میں یہ طے کر کے کہ یہ دائمی طور پر واجب الاطاعت ہی نہیں' آپ نے گویا اپنے لئے یہ حق حاصل کر لیا کہ قرآن مجید کے الفاظ کے جو

جی چاہے معنی نکالیں۔ صلوٰۃ کے معنی معاشرہ کردیں یا چور کے ہاتھ کاٹنے کا یہ مطلب قرار دے دیں کہ اس سے مراد ایسا ماحول پیدا کرنا ہے کہ چور کو چوری کی ضرورت ہی نہ رہے۔ جیسے کوئی کہہ دے کہ تو نے تو میرے ہاتھ کاٹ دیئے ہیں' تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تو نے میرے ہاتھ باندھ دیئے ہیں' میں اب کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ ایک استعارے کے انداز کی بات ہے۔ اسی طرح ان کے نزدیک چوروں کے ہاتھ کاٹ دینے کے معنی یہ ہیں کہ انہیں چوری کی ضرورت ہی نہ رہے۔ اب اگر ہر شخص صرف قرآن کے الفاظ لے کے بیٹھ جائے' اور اس کا تعلق سنت سے منقطع کردے تو پھر ان الفاظ کی جو چاہے تعبیر کر لے' جو چاہے تاویل کر لے' جہاں چاہے چلا جائے' جدھر چاہے پہنچ جائے۔ اس اعتبار سے میں نے عرض کیا کہ ان دونوں میں بڑا باریک سا فرق ہے۔ میرے نزدیک ان دونوں کے مابین ایک لفظی سا فرق ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ دونوں مسلک تقریباً ایک ہیں۔

مذکورہ بالا اندازِ فکر نے ہمارے ہاں کی بعض بڑی بڑی شخصیتوں کو بھی کسی نہ کسی درجے میں متأثر کیا ہے۔ آپ کے علم میں ہے کہ علامہ اقبال سے مجھے کس قدر تعلقِ خاطر اور ذہنی مناسبت ہے اور میرے دل میں ان کی کس قدر عظمت ہے۔ اگرچہ عمل کے معاملے میں وہ بہت پیچھے نظر آتے ہیں' لیکن فکر کے اعتبار سے وہ اس قدر بلندی پر ہیں کہ میں انہیں اسلام کے صحیح فکر کا مجدّد مانتا ہوں اور انہیں چودھویں صدی کا "مجدّدِ فکرِ اسلامی" قرار دیتا ہوں۔ اس کے باوجود ان کے ہاں بھی کچھ مغالطے موجود تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی کوئی نبی یا رسول نہیں تھے۔ ان کے خطبات "Reconstruction of Religious Thought in Islam" میں کچھ عبارات ایسی موجود ہیں جن میں ان دونوں مسلکوں کی کسی درجے میں تائید کا پہلو نکلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس پر معاف کرے۔ ۱۹۶۷ء میں میں نے "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ" نامی کتابچہ تحریر کیا تھا جو ہماری پوری تحریک قرآنی کا آغاز ہے۔ اس میں مَیں نے علامہ اقبال کے ان خطبات کے بارے میں صاف لکھا تھا:

> "آج سے پینتیس چالیس سال قبل علامہ اقبال مرحوم نے "الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید" کے سلسلے میں جو کام کیا تھا اس کا وہ حصہ تو اگرچہ بہت محلِ نظر ہے جو

شریعت و قانون اور اجماع و اجتہاد سے بحث کرتا ہے (اور جو فی الواقع "الٰہیات" سے براہ راست متعلق بھی نہیں ہے) تاہم اپنے اصل موضوع کے اعتبار سے علامہ مرحوم کی یہ کوشش بڑی فکر انگیز تھی"۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے عملی ڈھانچے کے سلسلے میں اور خاص طور پر اجتہاد کے ضمن میں ان کی بعض باتیں ایسی ہیں جن کو بنیاد بنا کر غلام احمد پرویز بھی اپنے آپ کو علامہ اقبال کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ بعض اعتبارات سے ان کا اپنے آپ کو اقبال سے منسوب کرنا غلط نہیں۔ لیکن علامہ اقبال بھی ہمارے لئے کوئی دلیل یا حجت نہیں ہیں۔ ہمارے لئے تو دین کے اندر حجت کتابُ اللہ اور سنّتِ رسول ﷺ ہے۔ چنانچہ جو چیز اس کے مطابق ہوگی اس کو لے لیں گے۔

البتہ میں سمجھتا ہوں کہ حقیقت کا ماننا اور اس کا اعتراف کرنا ضروری ہے اور ہمیں اتنا بالغ النظر ہو جانا چاہئے کہ اپنے بزرگوں کے بارے میں بھی اگر کوئی بات ایسی ہے تو ہم اس کو تسلیم کریں۔ تاہم اس سے یہ نہ ہو کہ ان کی عزت کم ہو جائے۔ اس لئے کہ ان کی خدمات کے پہلو کو سامنے رکھا جائے کہ انہوں نے کیا کیا ہے؟ اس اعتبار سے کسی خاص معاملے میں ان سے اختلاف کے باوجود ان کی عقیدت' ان کی محبت اور ان کی عظمت ہمارے دلوں میں قائم رہ سکتی ہے' اور وہ ہمارے دلوں میں موجود ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ اپنے فکر کے مقابلے میں عملی اعتبار سے ان کا پلڑا بہت ہلکا تھا۔ کچھ لوگ اس اظہارِ حقیقت پر بڑے ناراض ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کے نام کے ساتھ یا قائداعظم کے نام کے ساتھ "رحمتہ اللہ علیہ" کے الفاظ استعمال نہیں کرتا' حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ قائداعظم بھی ہمارے بہت بڑے محسن ہیں۔ لیکن رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ ہمارے ہاں ایسی شخصیتوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں جن کا کوئی دینی مقام ہو۔ وہ اولیاء اللہ میں سے ہوں یا ائمہ دین میں سے ہوں۔ مثلاً امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور امام ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ۔ ایسے حضرات جن میں دین پر عمل کے اعتبار سے کوئی کوتاہی نظر آ رہی ہو یا علمِ دین کے اعتبار سے ان کا کوئی بڑا مقام نہ ہو ان کے لئے "مرحوم" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ میں اپنے والد صاحب کو بھی "والدِ مرحوم" کہتا ہوں۔ اسی طرح علامہ

اقبال اور قائداعظم کو بھی مرحوم کہتا ہوں۔ معنوی طور پر ان دونوں اصطلاحات میں کوئی خاص فرق بھی نہیں ہے۔ مرحوم کے معنی بھی وہی ہیں۔ رحمت ہی سے مرحوم بنا ہے۔ "رحمتہ اللہ علیہ" کے معنی ہیں "اللہ کی رحمت ہو ان پر" اور مرحوم کے معنی بھی یہی ہیں۔ لیکن ہر لفظ کا جو ایک استعمال معیّن ہو جاتا ہے اسے ملحوظِ خاطر رکھنا چاہئے۔ "صلی اللہ علیہ وسلم" کا استعمال صرف حضورؐ کے لئے، "علیہ السلام" صرف انبیاء کے لئے' اور "رضی اللہ عنہ" صرف صحابہ کے لئے تعاملِ اُمّت سے ثابت ہے۔ یہ ایک طرح کی نشانی بن جاتی ہے۔ باقی ائمہ دین' علمی اعتبار سے ہوں یا صوفیائے کرام ہوں' ان کے لئے "رحمتہ اللہ علیہ" اور عام مسلمانوں کے لئے "مرحوم"، یہ ہمارا ایک استعمال (usage) ہے۔ علامہ اقبال کے بارے میں ہمارے یہاں بڑی بحثیں چلتی رہی ہیں۔ ایک زمانے میں اخبار میں اشفاق احمد صاحب کا بیان آیا تھا کہ "رات کا اقبال اور ہے' دِن کا اقبال اور ہے"۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اپنی شاعری میں اقبال کچھ اور ہے اور اپنی نثر میں اقبال کچھ اور نظر آتا ہے۔ یہ باتیں بالکل بے بنیاد نہیں ہیں۔ اصل میں اقبال کا فکر' ان کی سوچ اور ان کا جذبہ ان کی شاعری میں ہے۔ نثر میں جہاں انہوں نے فلسفے کے انداز میں بات کرنے کی کوشش کی ہے تو وہاں کچھ اونچ نیچ بھی ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ فلسفے کی اپنی حدود (limitations) ہیں' فلسفہ اس سے آگے جا ہی نہیں سکتا۔ آپ جب فلسفے کا انداز اور اس کا راستہ اختیار کریں گے تو اس میں آپ کو ان حدود کا پابند ہونا پڑے گا۔

اس ضمن میں ہمارے ہاں تیسرا مکتب فکر یہ ہے کہ قرآن بھی بتمام و کمال' لفظ بہ لفظ' ابدی اور دائمی طور پر واجب الاطاعت ہے' سوائے اس کے کہ خود قرآن ہی سے ثابت ہو جائے کہ یہ حکم ابتدا میں تھا' اس کے بعد اس سے بہتر حکم آگیا' (مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا) اور اسی طرح سنّتِ رسولؐ بھی دائماً واجب الاطاعت ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حاملین کو اہلِ سنّت کہا جاتا ہے' جو قرآن کے ساتھ سنتِ رسول کو بھی لازم سمجھتے ہیں۔ البتہ ان میں پھر دو بڑے بڑے مکاتب فکر موجود ہیں' جن میں سے ایک کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سنّتِ رسول تو واجب الاطاعت ہے' لیکن ہمارے لئے خلفائے راشدین کے اجتہادات کی پابندی لازم نہیں ہے۔ یہ رائے ہمارے

ہاں اہل حدیث حضرات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنے اپنے دور میں حضرت ابو بکرؓ' حضرت عمرؓ' حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے جو فیصلے کئے' اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خلفائے راشدین تھے' لیکن ان کے یہ فیصلے انتظامی احکام (Executive Orders) کی حیثیت رکھتے ہیں' کتابِ قانون کا مستقل جزو نہیں بن سکتے۔

لیکن دوسرا موقف یہ ہے کہ قرآن اور سنت کے بعد جو تیسری شے واجبؔ اور لازم ہے وہ "اجماع" ہے اور اجماع بتمام و کمال دورِ خلافتِ راشدہ ہی کا اجماع ہے۔ اس لیے کہ دورِ خلافتِ راشدہ میں ابھی فرقے موجود تھے اور نہ ابھی ایک سے زائد حکومتیں تھیں۔ ایک ہی دار الاسلام تھا اور ایک ہی مرکزی نظام تھا۔ پھر وہاں جو خلفاء تھے وہ حضورؐ کے بہترین اور جاں نثار ترین ساتھیوں میں سے تھے۔ وہ طویل ترین عرصے تک آپؐ کی صحبت اور آپؐ کی تعلیم و تزکیہ سے فیض یاب ہونے والے لوگ تھے۔ لہٰذا ان کا اجتہاد' جسے اُس وقت تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تائید بھی حاصل ہو گئی' اجماعِ امت کی اعلیٰ ترین شکل کا مظہر تھا۔ لہٰذا یہ بھی مستقل طور پر واجب الاطاعت ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حامل "اہل سنّت والجماعت" کہلاتے ہیں۔ ائمہ اربعہ کے پیروکار' خواہ وہ حنفی ہوں' مالکی ہوں' شافعی ہوں یا حنبلی ہوں' یہ سب اہل سنت والجماعت ہیں۔ یعنی یہ قرآن کے بعد سنتِ رسولؐ اور سنت کے بعد اجماع (اور خاص طور پر خلافت راشدہ کا اجماع) کو بھی واجب سمجھتے ہیں اور اس کی پابندی تاقیامِ قیامت لازم سمجھتے ہیں۔ جبکہ اہلحدیث حضرات کا نقطۂ نظر' جیسا کہ میں نے عرض کیا' اس اعتبار سے مختلف ہے کہ وہ خلفائے راشدین کے اجتہاد کو' چاہے اسے لوگوں نے قبول بھی کر لیا ہو' ہمیشہ کے لئے واجب الاطاعت نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک ان کی حیثیت محض Executive Orders کی تھی۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ہر حکومت انتظامی معاملات کے لئے جو فیصلے کر دیتی ہے اس حد تک وہ بالکل صحیح ہیں' لیکن یہ مستقل طور پر واجب الاطاعت نہیں ہیں۔

نقطۂ نظر کے اس فرق کے حوالے سے میں مثال کے طور پر دو چیزوں کا فرق آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں۔ ہمارے ہاں تراویح کا جو سارا جھگڑا چلتا ہے یہ اسی بنیاد پر

ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں معلوم ہے کہ ایک تو آپؐ نے تراویح کی نماز عشاء کے ساتھ متصل پڑھی نہ کبھی پڑھائی۔ یہ تاکید فرمائی کہ انسان رمضان کی راتوں میں زیادہ سے زیادہ وقت قرآن کے ساتھ گزارے' لیکن اس کا کوئی نظام حضورؐ نے نہیں بنایا۔ خود حضورؐ کا معمول یہ تھا کہ عام دنوں میں آپؐ کی جو تہجد کی نماز ہوتی تھی' اس کو آپؐ رمضان میں مزید طویل کر دیتے تھے۔ گویا آپؐ تہجد کے وقت قیام اللیل فرماتے تھے۔ اِس وقت ہمارے ہاں تراویح کی جو خاص اصطلاح اور اس کی معین شکل موجود ہے یہ حضورؐ کی زندگی میں ثابت ہی نہیں ہے۔ پھر یہ کہ حضورؐ نے اپنی حیاتِ طیبّہ میں تہجد کے وقت بھی صرف تین دن باجماعت تراویح پڑھائی ہے۔ چوتھے دن کچھ لوگ کھنکارتے بھی رہے اور آپؐ کے حجرے کے باہر اشارے کرتے رہے کہ ہم منتظر ہیں لیکن آپؐ باہر نہیں نکلے اور آپؐ نے صبح کہہ دیا کہ اگر میں اس طرح پابندی سے پڑھاؤں گا تو یہ تم پر فرض ہو جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ کے دل میں امت کے لئے جو شفقت اور رافت و رحمت تھی اس کے پیش نظر آپؐ کا طرز عمل یہ تھا۔ اس لئے کہ یہ ہر شخص کے بس کا روگ نہیں ہے۔ وہ لوگ بھی تو ہیں جنہوں نے صبح سے شام تک کَسّی چلائی ہو یا جن بیچاروں نے اینٹیں ڈھوئی ہوں اب وہ رات کو کیسے کھڑے رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ سب کے لئے فرض کر دینا تکلیف مالایطاق ہو جائے گا۔ یہ تھا حضورؐ کا معاملہ۔ لیکن چونکہ آپؐ کی طرف سے اس کی تاکید تھی' لہٰذا اس تاکید کی وجہ سے مسلمان انفرادی طور پر رمضان المبارک کے دوران قیام اللیل کا خصوصی اہتمام کرتے تھے اور اس میں قرآن پڑھتے تھے' کوئی زیادہ پڑھتا تو کوئی کم۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی ایسا ہوتا رہا۔ پھر ایسا بھی ہونے لگا کہ مسجد نبویؐ کے ایک کونے میں چار آدمی کھڑے ہیں' کوئی ایک حافظ ان کو مل گیا ہے' وہ پڑھ رہا ہے اور وہ پیچھے کھڑے ہوئے سن رہے ہیں۔ کسی دوسرے کونے میں کچھ اور لوگ کھڑے ہو گئے۔ اسی طرح کچھ فاصلے پر ایک اور جماعت کھڑی ہو گئی۔ یہ نقشہ مسجد نبوی میں مَیں نے بھی دیکھا ہے۔ مسجدِ نبوی رمضانِ مبارک میں رات کو کھلی ہوتی ہے۔ باقی سارا سال تو عشاء کے تقریباً ایک گھنٹے بعد بند ہو جاتی ہے اور تہجد کی اذان کے ساتھ کھلتی ہے' لیکن رمضان المبارک میں رات بھر کھلی رہتی ہے۔ ۱۹۷۰ء کا

پورا رمضان میں نے مسجدِ نبویؐ کے ماحول ہی میں گزارا ہے' اور میں مدینہ منورہ میں مقیم رہا ہوں۔ ان دنوں میں نے یہ نقشے دیکھے ہیں کہ تراویح کی نماز ہو جاتی تھی لیکن اس کے بعد بھی لوگ کھڑے رہتے تھے۔ وہاں پر حُفّاظ بہت کثرت کے ساتھ ہیں' کچھ لوگ ایک حافظ کے پیچھے یہاں کھڑے ہیں' کچھ دوسرے کے پیچھے ادھر کھڑے ہیں' کچھ تیسرے کے پیچھے ادھر کھڑے ہیں اور قرآن سن رہے ہیں۔ تو یہ معاملہ تقریباً ساری رات چلتا رہتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں داخل ہوئے' اور یہ نقشہ دیکھا تو آپؓ نے کہا کہ اس سے تو بہتر ہے کہ تمام مسلمان ایک امام کے پیچھے جمع ہو جائیں' باقاعدہ جماعت ہو اور عشاء کے متصلاً بعد تراویح کی بیس رکعت ادا کر لیا کریں۔ یہ حضرت عمرؓ کا اجتہاد ہے۔ اب جو تو حضرت عمرؓ کے اجتہاد کو لازم مانتے ہیں وہ تو اس کے پابند ہیں۔ چنانچہ حنفی' مالکی' شافعی اور حنبلی چاروں مسالک تراویح کے معاملے میں حضرت عمرؓ کے اجتہاد کی پابندی کرتے ہیں۔ ان میں سے تین کے نزدیک تراویح بیس رکعت ہے اور امام مالکؒ کے ماننے والے تو بیس سے بھی زیادہ چھتیس (۳۶) کے قائل ہیں۔ اہل حدیث اس پر اڑ کر کھڑے ہو گئے کہ جب یہ حضورؐ سے ثابت نہیں ہے اور یہ حضرت عمرؓ کا اجتہادی فیصلہ ہے تو یہ واجب الاطاعت نہیں ہے۔ لیکن میرے نزدیک وہ زیادتی یہ کرتے ہیں کہ پھر انہیں تین دن سے زیادہ باجماعت تراویح نہیں پڑھنی چاہئے اور عشاء کے ساتھ نہیں پڑھنی چاہئے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کے اجتہاد کا اتنا حصہ تو لے لیا کہ پورا مہینہ نماز تراویح باجماعت پڑھ رہے ہیں' اور اسے انہوں نے عشاء کے ساتھ متصل بھی کر دیا' لیکن اس بیس رکعت سے انہیں ایسی چڑ ہے کہ اس پر ان کی طرف سے لمبے لمبے مناظروں کے چیلنج ہوتے رہتے ہیں۔ بہرحال اس وقت میں اس مسئلہ کی تفصیل میں نہیں جا رہا' اس ضمن میں میری اپنی رائے میں نے عرض کر دی ہے۔ اصل میں یہ سمجھ لیجئے کہ یہ فرق کس وجہ سے ہے' کس بنیاد پر ہے۔

اسی طرح کا معاملہ "طلاق ثلاثہ" کا ہے' کہ کوئی شخص اگر ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین مرتبہ طلاق دے دیتا ہے تو ائمہ اربعہ کے نزدیک یہ طلاق مغلظ ہو گئی' اب یہ رجعی طلاق نہیں ہے اور اس کو اسے واپس لینے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ

کے زمانے تک یہ معاملہ تھا کہ آپ ایسے شخص سے پوچھ لیتے تھے کہ تمہاری نیت کیا تھی؟ آیا تم واقعتاً تین طلاقیں دینا چاہتے تھے یا تم ایسے ہی روا روی میں "طلاق' طلاق' طلاق" کہہ گئے جبکہ تمہاری نیت ایک ہی کی تھی۔ اگر وہ کہتا کہ میری نیت ایک ہی کی تھی تو آپ اس کو ایک ہی (رجعی) طلاق قرار دے کر رجوع کرنے کی اجازت دے دیتے تھے۔ اگر وہ کہتا تھا کہ میری نیت تو تین کی تھی لیکن اب میں رجوع کرنا چاہتا ہوں تو اسے اس کی اجازت نہ دی جاتی' بلکہ اسے بتا دیا جاتا کہ اگر تمہاری نیت تین کی تھی تو اب طلاق مغلظ واقع ہو چکی ہے اور اب تمہیں رجوع کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں بھی یہ معاملہ ایسے ہی چلتا رہا۔ حضرت عمرؓ نے یہ دیکھا کہ لوگوں نے اس چیز کو اپنی بیویوں پر دھونس جمانے کا ذریعہ بنا لیا ہے کہ جب غصہ آیا طلاق طلاق طلاق کہہ کر سارے کا سارا معاملہ ختم کر دیا' پھر یہ کہہ دیا کہ ہم نے تو ایک ہی طلاق دی تھی تین تو نہیں دی تھیں' لہٰذا ہم واپس لے لیتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک کھیل بن رہا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ دے دیا کہ اگر کوئی شخص ایک وقت میں تین طلاقیں دے گا تو وہ تین ہی شمار ہوں گی اور طلاق مغلظ واقع ہو جائے گی اور ساتھ ہی اس انداز سے طلاق دینے والے کو کوڑے بھی لگیں گے کہ اس نے ایسا کام کیوں کیا۔ اس وقت ہمارے ہاں یہی کی ہے۔ فقہ حنفی' فقہ مالکی' فقہ شافعی اور فقہ حنبلی سب میں ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں مغلظ ہی شمار ہوتی ہیں' لیکن اس کے ساتھ جو کوڑوں کی سزا تھی وہ نکال دی گئی ہے۔ اگر ایک مجلس میں تین طلاق دینے والے کو کوڑوں کی سزا بھی ملتی ہو تو غصہ بہت کم لوگوں کو آئے گا۔ پھر لوگ یہ نہیں کہیں گے کہ اجی میں نے غصے میں طلاق طلاق طلاق کہہ دیا تھا۔ انسان کا غصہ ایسا بے لگام نہیں ہوتا کہ بغیر سوچے سمجھے آ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو طاقتور پر غصہ نہیں آتا کمزور پہ آتا ہے۔

اس طرح یہ چار نقطۂ ہائے نظر ہمارے سامنے آ گئے۔ ایک یہ کہ قرآن بھی مکمل طور پر binding نہیں' بلکہ اس کے صرف "General Principles" مستقل طور پر واجب الاطاعت (eternally binding) ہیں' جب کہ معین احکام اس دور کے لئے تھے۔ دوسرا موقف یہ کہ قرآن تو پورے کا پورا binding ہے' لیکن اس کی تعبیر ہم

جیسے چاہیں کریں گے' سنّتِ رسولؐ سے اس کی تعبیر نہیں ہوگی' سنتِ رسولؐ صرف اپنے وقت کے لئے تھی۔ جب بھی اسلامی ریاست قائم ہوگی تو "مرکزِ ملت" کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ قرآن کی جو چاہے تعبیر کرے اور اس کی تعبیر اپنے وقت میں واجب العمل ہو گی۔ چنانچہ غلام احمد پرویز کا قول یہ تھا کہ جب تک نیا مرکزِ ملت وجود میں نہیں آتا نمازیں پانچ ہی رہیں گی۔ لیکن جب اسلامی ریاست قائم ہو جائے گی اور نیا مرکز ملت وجود میں آ جائے گا تو اسے پورا اختیار ہوگا کہ چاہے تو پانچوں کو منسوخ کر دے' چاہے تو نماز کی ہیئت ہی بدل دے۔ اس لئے کہ نماز کی یہ ہیئت اور شکل قرآن کے اندر موجود نہیں ہے۔ یہ تو سُنّتِ رسول ﷺ سے ثابت شدہ ہے۔

پھر دو موقف میں نے آپ کو ان لوگوں کے بتائے ہیں جو سنت کو لازم سمجھتے ہیں۔ ان میں سے ایک اہلحدیث ہیں جو سنت کو تو لازم سمجھتے ہیں لیکن سنّتِ خلفائے راشدین کو دائمی طور پر واجب العمل نہیں سمجھتے۔ اور ایک موقف اہل سنت والجماعت کا ہے جو قرآن کے بعد سنّتِ رسول ﷺ' اس کے بعد اجماع اور خاص طور پر خلفائے راشدین کے دور کے اجماع کو بھی مستقل طور پر واجب الاطاعت اور واجب العمل مانتے ہیں۔

پانچواں مسلک ائمہ مجتہدین کا ہے' جنہوں نے قرآن' سنتِ رسولؐ اور اجماع امت کو کتابِ قانون کے مستقل اجزاء سمجھتے ہوئے' ان کی بنیاد پر قیاس کرتے ہوئے اپنے اجتہادات کئے۔ ان ائمہ مجتہدین نے مذکورہ بالا تینوں ماٰخذ سے استنباط کرتے ہوئے اپنے اصول فقہ مرتب کئے کہ قرآن سے قوانین اخذ کرنے کے کیا اصول ہیں' حدیث کی درجہ بندی کیسے کی جائے گی' دو حدیثیں بظاہر ایک دوسرے سے متعارض ہوں تو پھر اس مسئلے کا فیصلہ کیسے کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر ایک حدیث یہ ہے کہ "جب بھی تم مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز ضرور پڑھو" یہ تحیۃ المسجد ہے جو مسجد کا حق ہے۔ یہ گویا مسجد کے ساتھ آپ کی greeting ہے۔ ایک اور حدیث یہ ہے کہ فجر کی نماز کے بعد سے لے کر سورج کے اچھی طرح طلوع ہو جانے تک کوئی سجدہ نہیں کیا جا سکتا اور عصر کی نماز کے بعد سے سورج کے غروب ہونے تک کوئی سجدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص مغرب سے نصف گھنٹہ قبل مسجد میں آتا ہے اور وہ عصر کی نماز پڑھ

چکا ہے تو دونوں احادیث میں سے کس پر عمل کرے جبکہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ آیا وہ تحیۃ المسجد ادا کرے یا نہ کرے؟ اس ضمن میں جمہور فقہاء کا اصول یہ ہے کہ نہی کی حدیث امر کی حدیث پر مقدم ہوتی ہے۔ یعنی حکم دینے والی حدیث کے مقابلے میں روکنے والی حدیث زیادہ قوی شمار کی جائے گی اور جس حدیث میں کوئی حکم دیا جا رہا ہو تو اس کی تعمیل نہی والی حدیث کی روشنی میں کی جائے گی۔ چنانچہ ایسے وقت میں تحیۃ المسجد ادا نہیں کرنی چاہئے۔ بعض علماء کی اس کے برعکس رائے بھی موجود ہے۔ بہرحال ہر فقہی رائے کی پشت پر کوئی اصول کار فرما ہوتا ہے۔

انہی اصولِ فقہ کی بناء پر ہمارے ہاں فقہی مسالک وجود میں آگئے' کہ یہ فقہ حنفی ہے' یہ فقہ مالکی ہے' یہ فقہ شافعی ہے اور یہ فقہ حنبلی ہے۔ یہ اہل سنت والجماعت کے چار مسالک ہیں۔ ان کے مابین اجتہاد کے چاروں مآخذ مشترک ہیں۔ یعنی i) قرآن ii) سنت iii) اجماعِ امت اور iv) قیاس۔ ان میں سے چوتھے ماخذ (قیاس) کے ضمن میں ہر مسلک کے پیروکار اپنے امام کے قیاس کی پیروی کرتے ہیں۔ چاروں ائمہ "مجتہدِ مطلق" کہلاتے ہیں۔ ان ائمہ اربعہ کے پیروکاروں کے نزدیک اب اجتہاد ان مسالک کے اندر اندر ہی ہو گا۔ اس کو اجتہاد فی المذہب کہتے ہیں۔ یعنی احناف کے ہاں جو بھی اجتہاد ہو گا وہ مذہبِ حنفی کے اصولوں کے مطابق ہو گا۔ اگرچہ اصولی طور پر وہ مانتے ہیں کہ ان ائمۂ مجتہدین کے بعد بھی کوئی مجتہدِ مطلق پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ بھی تو انسان ہی تھے' نحنُ رِجالٌ وھُم رِجالٌ۔ اگر وہ اجتہاد کر سکتے تھے تو ان کے پانچ سو سال بعد پیدا ہونے والے امام ابن تیمیہؒ اجتہاد کیوں نہیں کر سکتے' جنہوں نے کتاب و سنت سے پورا پورا استفادہ کیا ہے اور جنہیں سب علم کا بحرِ ذخّار مانتے ہیں' لیکن عملی طور پر ائمہ اربعہ کے مقلدین اجتہاد فی المذہب ہی کے قائل ہیں۔

اجتہاد کے لئے شرائطِ اہلیت

اجتہاد کے ضمن میں یہ بات بنیادی اہمیت کی حامل ہے کہ اجتہاد کی شرائط کیا ہیں؟ اس سلسلے میں ہمارے ہاں بڑا اختلاف رائے (controversy) پایا جاتا ہے۔ ایک

طرف جدید دانشور کہتے ہیں کہ اجتہاد کا حق سب کو حاصل ہے' آپ کون ہوتے ہیں کسی کو روکنے والے؟ اور دوسری طرف ہمارے علماء یہ کہتے ہیں کہ جب تک آپ نے چودہ علوم کی تحصیل نہ کی ہو آپ اس بارے میں زبان بھی نہیں کھول سکتے۔ اس ضمن میں میری رائے یہ ہے کہ اجتہاد کا حق ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہے' بلکہ اس کے لئے کچھ بنیادی شرائطِ اہلیت ہیں۔ اگر ہر شخص اپنے آپ کو مجتہد سمجھنے لگ جائے تو پھر تو دین بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا۔ اگر ایک شخص نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل نہیں کی اور وہ کسی کو نسخہ لکھ کر دے رہا ہے تو اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو گی؟ ایسا شخص تو مریض کی زندگی کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ اسی طرح اجتہاد کے لئے بھی جس بنیادی اہلیت کی ضرورت ہے اس کی چند لازمی شرائط ہیں۔ مثلاً :

۱) عربی کی گہری ممارست : اجتہاد کے لئے سب سے پہلے عربی زبان سے براہ راست واقفیت ضروری ہے' محض تراجم کی مدد سے قرآن و حدیث اور دیگر امہات الکتب تک رسائی ممکن نہیں۔ اس لئے کہ ترجمے کے ذریعے انسان کبھی بھی کسی شے کی اصل روح تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اجتہاد کے اصل مآخذ (sources) کتاب و سنت اور ائمہ محدثین و مجتہدین کی تمام تر کاوشیں عربی زبان میں ہیں۔ لہٰذا جب تک عربی کا بہت گہرا فہم بلکہ ذوق پیدا نہ ہو جائے اجتہاد کا خیال بھی دل میں نہ لانا چاہئے۔ آدمی میں عربی ادب کا ذوق پیدا ہو جائے تبھی وہ یہ جان سکتا ہے کہ کہیں بظاہر عموم نظر آتا ہے لیکن اس سے مراد خصوص ہے' اور یہ کہ فلاں لفظ کس جگہ اپنے لغوی مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور کہاں یہ محاورے اور استعارے کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ چنانچہ جب تک انسان میں عربی کا گہرا فہم نہ ہو' اسے ادب سے واقفیت نہ ہو' صَرف و نحو اور فصاحت و بلاغت کے اصولوں سے شناسائی نہ ہو' غرضیکہ عربی زبان پر ہر اعتبار سے دسترس حاصل نہ ہو اسے اپنے لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا نہیں سمجھنا چاہئے۔ اگرچہ قانونی طور پر کسی شخص پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی اور ہر مسلمان کو حق حاصل ہے کہ وہ بات کہے۔ لیکن اجتہاد کرنے والے کو خود سوچنا چاہئے کہ یہ کام اس کے کرنے کا ہے یا نہیں۔

۲) تفسیر و تاویل کا علم : قرآن کی تفسیر سے واقفیت اور اس کی تاویل کا علم بھی اجتہاد کی اہلیت کے لئے ضروری شرط ہے۔ اگر آپ نے صرف انڈیکس کی مدد سے دیکھ لیا کہ قرآن میں فلاں مضمون کہاں کہاں آیا ہے اور وہ آیتیں نکال کے دیکھ لیں تو یہ اجتہاد کے لئے کافی نہیں۔ قرآن حکیم کی آیات میں ناسخ و منسوخ کا مسئلہ بھی ہے اور عام و خاص کا بھی۔ دیکھنا پڑتا ہے کہ کوئی لفظ کس وقت کس معنیٰ میں آ رہا ہے۔ کوئی لفظ اپنے لغوی مفہوم میں آ رہا ہے یا اس کا اپنا کوئی اصطلاحی مفہوم ہے۔ اگر آپ کو تفسیر و تاویل کا علم حاصل نہیں ہے تو آپ قرآن سے اجتہاد کیسے کریں گے؟

۳) علومِ حدیث سے واقفیت : اجتہاد کی اہلیت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان حدیث کے تقریباً پورے ذخیرے سے گزر چکا ہو' جسے ہمارے ہاں دورۂ حدیث کہا جاتا ہے۔ یہ اصل میں حدیث کی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ تیزی کے ساتھ ذخیرۂ حدیث سے گزارا جاتا ہے' لیکن اس کی اپنی افادیت ہے۔ آدمی تقریباً پوری صحاح ستہ سے ایک بار تو تیزی کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ اس کے بعد جب انسان احادیث پر غور و فکر اور تدبّر کرے تو پھر ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ایک ایک حدیث پر ایک ایک کتاب لکھ دے۔ پھر حدیث کا معاملہ قرآن کی نسبت کہیں زیادہ مشکل ہے۔ قرآن مجید کی تفسیر و تاویل تو حدیث کی نسبت بہت آسان ہے' جبکہ حدیث کا علم بہت مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے بارے میں یہ تو معلوم ہے کہ فلاں لفظ قرآن ہی کا ہے۔ اور جو کچھ قرآن میں ہے وہ سب کا سب تواتر سے ثابت ہے۔ لیکن احادیث کی تو جانچ پرکھ کرنی پڑتی ہے کہ یہ ضعیف ہے' یہ قوی ہے' یہ خبر احاد ہے۔ اس حدیث کے فلاں راوی کے اندر یہ سقم ہے اور فلاں کے اندر یہ ہے۔ پھر حدیث کی درجہ بندیاں ہیں' اسماء الرجال اور جرح و تعدیل کا ایک سلسلہ ہے' روایت اور درایت کا علم ہے' سَنَد اور متن کا معاملہ ہے۔ غرضیکہ یہ بہت مشکل کام ہے' آسان کام نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ مانتے ہیں کہ سنت رسول ﷺ اسلامی قانون کا مستقل اور دائمی ماخذ (source) ہے تو اس کی واقفیت کے بغیر اجتہاد کیسے کریں گے؟

۴) اصول فقہ سے آگاہی : اجتہاد کی صلاحیت کے لئے ائمہ مجتہدین کے بنائے ہوئے

اصولِ فقہ سے واقفیت بھی ازبس ضروری ہے۔ اس اعتبار سے آج کل کے علماء بھی بالکل ناکام ہیں کیونکہ وہ اپنے مسلک کے اصول فقہ سے تو واقف ہوتے ہیں لیکن دوسرے مسالک کے اصول سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ مثلاً حنفی مسلک کا کوئی مدرسہ ہے تو وہاں فقہ حنفی کے اصول فقہ تو پڑھائے جاتے ہیں جبکہ دوسری تینوں فقہوں کے اصولوں سے وہاں پر کوئی آگاہی نہیں ہوتی' وہ انہیں پڑھائے ہی نہیں جاتے۔ حالانکہ مجتہد کے لئے ضروری ہے کہ وہ سب کے اصولوں سے واقف ہو۔ اسے معلوم ہو کہ امام ابو حنیفہ نے کوئی بات کہی ہے تو ان کا مستدل کیا تھا اور کس اصول کے تحت انہوں نے فلاں حدیث کو مرجوح قرار دیتے ہوئے اپنی رائے کو اس پر راجح قرار دیا ہے۔ اسی طرح دوسرے ائمہ کے اصول فقہ معلوم ہونا بھی ضروری ہیں۔ ائمہ مجتہدین میں سے اصول فقہ کے بانی امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ ہیں اور اس ضمن میں ان کی "کتابُ الاُم" بڑی معرکتہ الآراء کتاب ہے' لیکن ہمارے علمائے کرام اس کا مطالعہ بھی نہیں کرتے۔ مجتہد کے لئے اصول فقہ سے واقفیت کے ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ مختلف ائمہ کرام نے کس کس مسئلے میں کیا رائے دی ہے اور سلف کے اجتہادات کیا ہیں؟

۵) دورِ جدید کے مسائل سے واقفیت : مذکورہ بالا شرائط کے علاوہ اب میں ایک ایسی بات کہہ رہا ہوں کہ جو طبقہ علماء میں سے کوئی بھی نہیں کہے گا اور وہ یہ کہ آپ جس دور میں اجتہاد کرنے چلے ہیں آپ کو اس دور کے ظروف و احوال اور اس دور کے مسائل سے براہ راست واقف ہونا ضروری ہے۔ اگر آپ کو پتہ ہی نہیں کہ بینکنگ کس بلا کا نام ہے' پیپر کرنسی کس شے کا نام ہے اور سٹاک مارکیٹ کیا ہے؟ تو پھر آپ کیا اجتہاد کریں گے؟ ایک شے کا آپ نے آج کے ماحول پر اطلاق کرنا ہے اور اس کے بارے میں آپ کو معلومات ہی نہیں تو آپ اجتہاد کیسے کریں گے' اگرچہ آپ کو قرآن و حدیث کا علم بھی حاصل ہو؟ چنانچہ دور جدید میں اجتہاد کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ اِس دور کے نظریات و افکار جو ہماری تہذیب و تمدن پر اثر انداز ہو رہے ہیں اور اِس وقت دنیا کے نظام کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں' کم از کم ان کے اصول و مبادی سے تو واقفیت ہو اور خاص طور پر دنیا میں جو سیاسی نظام چل رہا ہے' اس کے بارے میں معلومات ہوں'

State Craft کے بارے میں آگاہی ہو۔ ریاست کے جو تین ستون شمار ہوتے ہیں' یعنی انتظامیہ (Executive)' عدلیہ (Judiciary) اور مقننہ (Legislature) اور ان تینوں کے مابین قدغنی توازنِ اقتدار (Checks and Balances) کے نظام کا فہم حاصل ہو۔ پھر اگر کسی شخص کو یہی پتہ نہیں کہ آج کی معاشیات اور اقتصادیات کیا ہیں' تو وہ مجتہد کیسے ہو جائے گا؟ میرے نزدیک یہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ کٹھن ہے جو وہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے اس وقت صورتحال یہ ہے کہ کچھ لوگ تو کتاب و سنت اور فقہ کے جاننے والے ہیں' چاہے انہوں نے صرف فقہ حنفی پڑھی ہے اور امام شافعی کے اصول نہیں پڑھے' لیکن جدید علوم سے بالکل ناواقف ہیں' الاماشاء اللہ' شاذ ہی کچھ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں علماء میں سے اس وقت مولانا تقی عثمانی صاحب ہیں کہ انہوں نے علوم جدیدہ کا مطالعہ بھی کیا ہے' انگریزی زبان پڑھی ہے' جدید قانون پڑھا ہے اور اس میں انہیں درک حاصل ہے۔ لیکن ایسے لوگ بالکل شاذ ہیں۔ پھر یہ کہ ہمارے ہاں علماء پر تقلید کا جو سخت دباؤ ہو جاتا ہے تو پھر وہ اپنے دائرے سے باہر نکلنے کو تیار نہیں ہوتے' اس لئے کہ انہیں علم ہوتا ہے کہ اس طرح وہ برادری سے باہر ہو جائیں گے۔ اگر آپ نے حنفیوں کی عام روش سے ہٹ کر بات کہہ دی تو حنفی دائرے سے خارج ہو جائیں گے۔ لہٰذا اس میں انسان کو بہت سی مصلحتیں دیکھنی پڑتی ہیں۔ کوئی شخص اپنی برادری سے باہر ہونا آسانی سے پسند نہیں کرتا۔ دوسری طرف ہمارے ہاں جو جدید تعلیم یافتہ افراد ہیں وہ دینی علوم سے بے بہرہ ہیں۔

جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے' علامہ اقبال کے بعض الفاظ اور بعض جملوں سے جو "تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں آئے ہیں' ان خیالات کی بھی کچھ تائید مل جاتی ہے' یا یوں کہنا چاہئے کہ ان سے کسی نہ کسی طرح ان نظریات کی تائید حاصل کی جاسکتی ہے جو میں نے پہلے دو مسالک کے ضمن میں بیان کئے ہیں۔ یعنی (i) قرآن مجید کے بھی صرف عمومی اصول دائمی طور پر واجب العمل ہیں اور معین احکام مخصوص حالات کے لئے تھے۔ (ii) قرآن تو دائمی ہے لیکن سنت رسول ہمیشہ کے لئے واجب العمل نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کے قلم سے کچھ چیزیں ایسی نکلی ہیں کہ اگر کوئی شخص چاہے تو ان سے وہ

معنی نکال سکتا ہے۔ لیکن دوسری طرف ان کے اشعار کی روشنی میں دیکھا جائے تو علامہ اقبال کا معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اصل اقبال اپنی شاعری میں ہے۔ شاعری میں انسان بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے اصل تصورات اور اصل فکر کو بیان کرتا ہے۔ پھر اس میں جذبہ بھی شامل ہوتا ہے۔ جبکہ آپ نثر لکھ رہے ہوتے ہیں تو آپ کو صغریٰ کبریٰ جوڑ کر بات کرنی پڑتی ہے اور آپ اس میں اپنے وجدان یا اس طرح کے کسی اور ماخذ کو بروئے کار نہیں لا سکتے۔ شاعر آدمی جب شعر کہہ رہا ہوتا ہے تو اپنے وجدان (intution) اور اپنے اندرونی جذبات و احساسات کے حوالے سے بہت سی باتیں کہہ دیتا ہے۔ یہ باتیں وہ ہوتی ہیں جنہیں آپ محسوس کر سکتے ہیں لیکن انہیں مدلل نہیں کر سکتے۔ اپنے اذعان (conviction) کے بارے میں آپ یہی کہہ سکتے ہیں کہ "I cannot prove it but I do feel it" شاعری میں انسان کے احساسات و جذبات' اس کے وجدان' اور اس کے ذاتی اذعان (personal convictions) سب کچھ آجاتا ہے۔ چنانچہ اگر آپ اقبال کو کلی طور پر دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ آپ کو اپنی شاعری میں ملے گا نہ کہ نثر میں۔

تو شاعری میں اب دیکھئے اقبال اجتہاد کے بارے میں کیا کہتے ہیں ؎

زجتہادِ عالمانِ کم نظر اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

یعنی عالمانِ کم نظر کے اجتہاد سے تو یہی بہتر ہے کہ اسلاف کی جو آراء ہیں انہی کی پیروی کی جائے۔ اس شعر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال بہت بڑا مقلّد ہے جو "اقتدا بر رفتگاں" کا درس دے رہا ہے۔ اس لئے کہ اپنے اسلاف کے بارے میں ہم خوب جانتے ہیں' ائمہ مجتہدین کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ جنس بازاری نہیں تھے جسے خریدا جا سکتا ہو۔ ان کی پوری زندگیاں درویشی میں گزریں' انہوں نے دنیا نہیں بنائی۔ ہاں یہ ماننا پڑے گا کہ ان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ کسی مجتہد کے بارے میں ہماری رائے یہ نہیں ہے کہ وہ معصوم ہے۔ اصول یہ ہے کہ "مجتہد مخطی" کو بھی اکہرا ثواب ملتا ہے' جبکہ "مجتہد مصیب" دوہرے ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ ایک شخص نے پوری طرح مشقت اٹھائی ہے' محنت کی ہے' خوب سوچا ہے' خوب کھنگالا ہے' اپنی پوری صلاحیت اور استعداد صرف کی

ہے' اس کے بعد ایک بات کہہ رہا ہے' لیکن غلط کہہ گیا تو وہ ثواب سے تو محروم نہیں رہے گا۔ اس کو بھی اکہرا ثواب ملتا ہے۔ اس کی محنت و مشقت رائیگاں نہیں جاتی۔ جبکہ مجتہد مصیب' جو صحیح رائے تک پہنچ گیا ہے' اس کو دوہرا ثواب ملے گا۔ اس حوالے سے اقبال کہہ رہے ہیں کہ جو لوگ دنیا سے چلے گئے اور ان کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ ان کی زندگیاں اس طور سے گزریں کہ وہ دنیا کے طالب نہیں تھے' ان کا تقویٰ اور ان کی للّٰہیت سے ہم باخبر ہیں' ان کی اقتدا میں لگے رہنے میں کم اندیشے اور خطرات ہیں' بہ نسبت اس کے کہ ہم عالمانِ کم نظر کے اجتہادات کے مطابق اپنی زندگی کے رخ کو ڈھال دیں۔

عالمانِ کم نظر کی وضاحت میں کر چکا ہوں۔ جس شخص میں مذکورہ بالا شرائط موجود نہیں وہ عالمِ کم نظر ہے۔ نوٹ کیجئے کہ جو شخص قرآن و سنت اور حدیث کا تو پورا ماہر ہے لیکن جدید علوم اور دورِ جدید کے مسائل سے واقف نہیں وہ بھی عالمِ کم نظر ہے۔ مجتہد کو معلوم ہونا چاہئے کہ آج کا مسئلہ کیا ہے۔ اگر وہ مسئلے کی پیچیدگیوں ہی سے واقف نہیں ہے تو اسے حل کیسے کرے گا۔ اور "عالمانِ کم نظر" کا سب سے بڑا اطلاق ان دانشوروں پر ہو گا جو اگرچہ پی ایچ ڈی کر کے آئے ہوں' جدید علوم کے ماہرین شمار ہوتے ہوں' لیکن انہیں عربی زبان بھی نہیں آتی اور وہ تراجم کی مدد سے اور انڈکس کے سہارے قرآن مجید سے آیات نکال کر ان کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔ اور تراجم بھی وہ اختیار کرتے ہیں جو مستشرقین کے کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ ان مستشرقین کی ترجمانی کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے حضرات کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا سمجھیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں ہی عرض کر دیا تھا' یہ ایک اصولی بات ہے۔ باقی یہ کہ اسلامی ریاست میں بات کہنے کا حق تو ہر شخص کو حاصل ہو گا۔ اصل فیصلہ طلب بات یہ ہو گی کہ وہاں پر یعنی اسلامی ریاست میں کس کا اجتہاد نافذ ہو گا۔ فرض کیجئے میں بھی مجتہد بن کر کھڑا ہو جاتا ہوں اور کوئی دوسرا شخص بھی مجتہد ہے تو سوال یہ ہے کہ کس کا اجتہاد قانون کی کتاب کا جزو بنے گا۔ اس مسئلے کا تعلق دراصل نفسِ اجتہاد سے نہیں ہے بلکہ ریاست کی نوعیت سے ہے۔ اس ضمن میں یہ دیکھنا ہو گا کہ اس میں طاقت اور اختیارات کا سرچشمہ کون ہے؟ اس ریاست کا دستوری ڈھانچہ کیا ہے؟ اس کا

(باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ کیجئے)

روزے کی عبادت
حکمت و مقاصد

تحریر : عمران ابن حسین
ترجمہ و تلخیص : ڈاکٹر احمد افضال

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم میں سے ہر ایک کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے' اور ہر ایک سے اس کی بھیڑوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ بدقسمتی سے آج شمالی امریکہ میں مسلمانوں کے ایسے چرواہے پیدا ہو گئے ہیں جو اپنی بھیڑوں کی حفاظت کرنے کے بجائے انہیں خود بھیڑیوں کے آگے ڈال رہے ہیں۔ یہ ہمارے وہ رہنما ہیں جو اپنی بے علمی کے باوجود اجتہاد کر کے بینک کے سود کو حلال قرار دیتے ہیں۔ مسلم دنیا میں صورت حال اس سے بھی زیادہ سنگین ہے' جہاں بھیڑوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری خود بھیڑیوں کے ہاتھوں میں آ گئی ہے! رمضان اور صوم سے متعلق یہ مضمون اس امید کے ساتھ لکھا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کے قائد اور رہنما اسے غور سے پڑھیں گے اور یہ ان کے لئے صحیح طرز عمل کو واضح کرنے کا باعث بنے گا۔ ان شاء اللہ۔

آج امتِ مسلمہ کی حالت زار ایک انتہائی کمزور شخص کی سی ہے جس کے بدن پر جا بجا بڑے بڑے زخم ہوں اور جن سے مستقل خون رس رہا ہو۔ کشمیر' فلسطین' بوسنیا اور دوسرے خطوں میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ ہماری اجتماعی کمزوری اور بے بسی کا عکاس ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان ان حالات پر کڑھتے ہیں لیکن ہمارے قائدین اور مقتدر افراد کو اپنے آرام و آسائش سے ہی فرصت نہیں ہے۔ دوسری طرف قرآن کا حکم ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ "قوت" فراہم کریں تا کہ اللہ کے دشمنوں کو خوف زدہ اور مرعوب کیا جا سکے (الانفال ۸ : ۶۰)' تا کہ ظالموں کے خلاف

جنگ کی جاسکے (الحج ۲۲ : ۳۹-۴۱) اور تاکہ مظلوموں کی دادرسی ممکن ہو سکے (النساء ۴ : ۷۵)۔ "قوت" کو حاصل کرنے اور برقرار رکھنے کی بدولت ہی وہ حالات پیدا ہو سکیں گے جن کی بدولت غیر مسلموں کے لئے اسلام کی سچائی مبرہن اور واضح ہو گی (الانفال ۸ : ۷-۸) سوال یہ ہے کہ امت مسلمہ اپنی کمزوری اور بے بسی سے کیونکر نجات پائے؟ وہ اس "قوت" کو کس طرح دوبارہ حاصل کرے جس کے حصول کا قرآن حکیم حکم دے رہا ہے؟ غور طلب امر یہ بھی ہے کہ قرآن کی رو سے "قوت" کیا ہے اور کس طرح حاصل ہوتی ہے؟ کیا مال و دولت اور اسباب و وسائل سے "قوت" کا حصول ممکن ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو قریش کی فوج بے سروسامان مہاجرین سے بدر کے معرکے میں شکست نہ کھاتی' اور نہ ایک سپرپاور کی کیل کانٹے سے لیس افواج کو ویت نام میں ذلت آمیز ہزیمت کا سامنا کرنا پڑتا۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ مال و دولت' اسباب و وسائل اور اسلحے کی فراہمی فی الواقع "قوت" کے حصول کے لئے نہایت اہم ہیں' لیکن انہیں "قوت" کی اساس نہیں کہا جا سکتا۔ اصل میں "قوت" تو آزادی' علم' اخلاقی اقدار' ایمان' اتحاد' بھائی چارے' نظم' اور صالح قیادت ہی کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے۔

آج امت مسلمہ اپنے فیصلے خود کرنے کی آزادی سے بھی محروم ہو چکی ہے' لیکن سیاسی و معاشی آزادی کے حصول سے پہلے ایک باطنی قسم کی آزادی کا حصول لازم ہے۔ ایک مشہور حدیث قدسی کی رو سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "روزہ خاص میرے لئے ہے اور میں خود اس کی جزا دوں گا"۔ یہ نکتہ جتنا سادہ ہے اسی قدر اہم اور زوردار بھی ہے کہ اگر ہم خاص اللہ کے لئے روزہ رکھنا سیکھ لیں تو اس کی برکت سے صرف اللہ کے لئے جینے کی راہ بھی ہم پر کھلتی چلی جائے گی۔ فی الحقیقت وہی مسلمان صحیح معنوں میں آزاد ہے جو صرف اللہ کے لئے زندگی گزارتا ہے' جس کے اعمال و افعال کے پیچھے صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے' اور جسے اللہ کے معاملے میں دنیا اور دنیا والوں کی تنقید یا ملامت کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ رمضان کے روزے کی بدولت ایک مسلمان میں اخلاص کی یہ کیفیت پیدا ہو سکتی ہے جو اس کی باطنی آزادی کا سبب بنتی ہے' اور یہ باطنی یا حقیقی آزادی ہی آگے چل کر پوری امت کے لئے سیاسی و معاشی آزادی کی راہ کھولتی ہے جو "قوت" کی بنیادوں

میں سے ایک بنیاد ہے۔

بدقسمتی سے آج ہمارے درمیان ایسے مسلمانوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے جو سیکولرازم کے زیر اثر رمضان کے روزوں کے ضمن میں لاتعلقی اور بے اعتنائی کی روش اختیار کرتے ہیں' اور جو اکثر و بیشتر روزہ رکھنے کو ضروری ہی نہیں سمجھتے۔ ایسے مسلمانوں کو جان لینا چاہئے کہ لادینیت کی بنیاد پر قائم معاشرے کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے اثر اور دباؤ کی وجہ سے حق و باطل' حلال و حرام' اور معروف و منکر کے درمیان فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت رفتہ رفتہ کم ہو کر بالآخر مٹ جاتی ہے' یہاں تک کہ لوگوں کے اذہان سے یہ تصور بھی محو ہو جاتا ہے کہ بعض افعال "گناہ" ہیں! لادین معاشرے میں اللہ کا کلام نہیں بلکہ خود انسان اور اس کی خواہشات مرکزی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ وہ انجام ہے جو امریکہ میں یہودیت اور مسیحیت کو پیش آ چکا ہے' اور جس کا اب اسلام اور مسلمانوں کو بھی سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے لئے ناگزیر تھا کہ ان کے مذاہب لادینیت کے سیلاب میں بہہ جاتے' کیونکہ انہوں نے اللہ کی عطا کردہ سچائی کو مسخ کر دیا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے پاس اس ضمن میں کوئی عذر نہیں ہے، اس لئے کہ قرآن کی حفاظت کا وعدہ خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے' نیز اس کی بنیاد پر ایک مقدس معاشرے کی تشکیل کا پورا نمونہ بھی حضور ﷺ کے سنت میں موجود ہے۔ اگر ہم سیکولرازم کی جاہلیتِ جدیدہ میں گم ہو کر اپنا تشخص نہیں کھونا چاہتے تو لازم ہے کہ ہم ہر وقت یہ حقیقت اپنے پیش نظر رکھیں کہ اسلام عالم انسانیت کے سامنے زندگی اور تمدن کا ایک متبادل نمونہ رکھتا ہے۔ ایک ایسا مقدس نمونہ جو سیکولر نمونے کے برعکس عالم غیب اور ماورائی حقیقتوں سے ماخوذ ہے۔ روزے کی عبادت ہمارا تعلق اس ماورائی عالم کے ساتھ استوار کرتی ہے اور اسی تعلق کی بدولت ہماری مادی اور عالم غیب کی مقدس دنیا کے مابین ہم آہنگی جنم لیتی ہے۔ مقدس زندگی وہ ہے جو صرف اللہ کی رضا کے لئے بسر کی جائے۔ یہ وہ زندگی ہے جسے اختیار کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے' اور یہی راستہ "قوت" کے حصول کا راستہ ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو' تم پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلی امتوں پر فرض کیا گیا تھا۔ امید ہے کہ اس سے تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو

گی"۔ (البقرہ : ۱۸۳)

یعنی روزے کی عبادت ہمیشہ سے مذہبی طرز حیات کا لازمہ رہی ہے' اور اس کا مقصد تقویٰ یا خدا ترسی کا حصول ہے۔ تقویٰ ہی وہ کسوٹی ہے جس سے ہم روزے کی افادیت کو جانچ سکتے ہیں۔ اگر روزے کی بدولت کسی شخص میں تقویٰ پیدا ہو رہا ہے تو گویا روزے کی عبادت سے اصل مقصود حاصل ہو رہا ہے' لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں سیدھے اور صحیح راستے سے انحراف کیا گیا ہے۔ اگرچہ آج دنیا کے مسلمانوں کی اکثریت روزوں کی پابندی کرتی ہے' تاہم بڑی تعداد میں مسلمان ایسے بھی ہیں جو رمضان کے روزے نہیں رکھتے۔ اس کی وجہ مغربی تہذیب اور مادہ پرستانہ طرز فکر کا اثر ہے' کیونکہ جدید ذہن تقویٰ یا خدا ترسی کو سرے سے کوئی اہم یا مطلوب شے سمجھتا ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ روزہ اس لئے نہیں رکھتے کہ یہ ان کی پیشہ ورانہ مصروفیات میں خلل ڈالتا ہے' یا وہ لوگ جدید تمدن کی آسائشوں کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ کسی قسم کی مشقت جھیلنے کے لئے خود کو تیار نہیں پاتے۔ ایسے مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے واضح احکام کی خلاف ورزی کر کے "اسلام" یعنی اطاعت و فرمانبرداری کے دائرے سے تجاوز کر رہے ہیں۔

تقویٰ کی ایک جہت اخلاقی ہے اور دوسری روحانی۔ اخلاقی لحاظ سے تقویٰ کا اظہار اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اوامر و نواہی کی پابندی سے ہوتا ہے۔ اخلاقی اقدار کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ "قوت" کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے۔ امت مسلمہ کی "قوت" کا اظہار سب سے پہلے غزوۂ بدر (۱۷/ رمضان) کے موقع پر ہوا' اور یہی وہ رمضان تھا جس سے متصلاً قبل روزے کی فرضیت کا حکم نازل ہوا تھا۔ یہ بات روز روشن کی طرح ہم پر واضح ہو جانا چاہئے کہ رمضان کے روزوں کا ایک بڑا مقصد مسلمانوں میں "قوت" پیدا کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز وحی کے ۱۴ برس بعد فرضیت صوم کے احکام نازل ہوئے' یعنی عین اس موقع پر جب جنگوں کا آغاز ہونے والا تھا۔ روزے کی بدولت اخلاقی اقدار استوار ہوتی ہیں اور پروان چڑھتی ہیں' اور "قوت" کا دارومدار انہی اخلاقی اقدار پر ہے۔ کسی قوم کی اخلاقی صحت ہی اس کی بقا' استحکام اور نشوونما کی ضامن ہوتی ہے

چنانچہ قرآن بار بار مثالیں دے کر بتاتا ہے کہ اخلاقی زوال کے نتیجے میں کس طرح اقوام ہلاک ہو جاتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزے کی عبادت قومی استحکام اور ایک صحت مند معاشرے اور تمدن کی تعمیر کے لئے بھی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اخلاقی اقدار صرف مذہب ہی کی بدولت پیدا ہو سکتی ہیں' لادینیت میں اخلاقی اقدار کو پیدا کرنے اور پروان چڑھانے کی صلاحیت نہیں ہے۔ جدید قومی ریاست کی بنیاد سیکولرازم اور وطنی قومیت پر رکھی گئی ہے' یہی وجہ ہے کہ ایسی ریاست میں مذہب ایک طاقتور اخلاقی داعیہ کی حیثیت سے معاشرے کی تشکیل میں اپنا کردار ادا نہیں کر پاتا۔ دوسری طرف قومی ریاست کے لئے یہ امر محال ہے کہ وہ وطنیت کی تنگ نظری سے ماوراء ہو کر مطلق اخلاقی اقدار کے تصور کو قبول کرے' کیونکہ اس کے لئے اسے تمام نوع انسانی کی وحدت اور اخوت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔

تقویٰ کی ایک روحانی جہت بھی ہے جس کا دارومدار ماورائے حواس حقائق پر ہے۔ سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ قرآن کی واقعی اور نتیجہ خیز ہدایت سے وہی افراد فیضیاب ہو سکتے ہیں جنہیں تقویٰ کی دولت حاصل ہو۔ تقویٰ کے اجزائے ترکیبی میں سب سے پہلی شے غیب پر ایمان ہے' پھر اقامتِ صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ' قرآن مجید اور گزشتہ صحیفوں پر ایمان' اور آخر میں آخرت پر مکمل یقین! معلوم ہوا کہ تقویٰ کا انحصار بنیادی طور پر اس حقیقت کو ماننے پر ہے کہ اس مادی دنیا کے سوا جس میں ہم رہتے ہیں ایک اور عالم بھی ہے جو ہمارے حواس کی گرفت سے ماوراء ہے۔ ہماری یہ دنیا عارضی اور فانی ہے' جبکہ یہ عالم غیب یا ماورائی دنیا مستقل اور پائیدار حقیقتوں کی مظہر ہے۔ ہماری دنیا ایک روز ختم ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ پھر ایک دوسرا عالم پیدا کرے گا' جہاں تمام انسانوں کے اعمال کا حساب کتاب ہو گا اور پھر انہیں ان کی جزاء یا سزا ملے گی۔ تقویٰ کا دارومدار اس حقیقت کو سمجھنے پر بھی ہے کہ "دین" ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے' تمام آسمانی صحیفوں اور تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ خود "الحق" ہے' اور اس کی ذات واحد اور احد ہے' اس لئے سچائی بھی صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ دین کی وحدت کا مطلب یہ ہے کہ ہم سچائی کا احترام کریں خواہ وہ کسی بھی گروہ سے ہمیں حاصل

ہو۔ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی موجودہ زندگی کو آخرت کی فلاح کے لئے بسر کرے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ کے لئے زندگی بسر کرے! قرآن حکیم کی رو سے قربانی کے جانوروں کا گوشت اور خون اللہ تک نہیں پہنچتا بلکہ انسانوں کا تقویٰ اللہ تک پہنچتے ہے۔ یعنی دین کی اصل روح تقویٰ ہے' اور روزے کی بدولت ایک انسان دین کی روح تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

اس سے پہلے کہ انسان کا تقویٰ اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ سکے' نفس انسانی کو ایک ایسی راہ طے کرنا پڑتی ہے جو اسے درجہ بدرجہ جسمانی سے اخلاقی' اور اخلاقی سے روحانی منزلوں پر پہنچاتی ہے۔ پہلا مرحلہ حیوانی تقاضوں پر قابو پانے کا ہے' جسے قرآن کی اصطلاح میں "نفسِ امارہ" کہا گیا ہے۔ روزے کی عبادت اس مقصد کے لئے خاص طور پر مد ثابت ہوتی ہے۔ جب اس ضبط نفس کے نتیجے میں انسان اپنے حیوانی تقاضوں کو پس پشت ڈال کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اسے اپنے گناہوں کا شدید احساس بھی پریشان کرنے لگتا ہے۔ اس مرحلے کو قرآن نے "نفسِ لوامہ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے بعد جب تزکیہ اور تطہیر کا عمل آگے بڑھتا ہے تو انسان کے اندر تقویٰ پروان چڑھنے لگتا ہے۔ یہ روحانی کمال کا مرحلہ ہے جسے قرآن میں "نفسِ مطمئنہ" کہا گیا ہے۔

مذاہب کی تاریخ گواہ ہے کہ انسان کا دنیا سے منہ موڑ کر حقیقت مطلقہ کی طرف متوجہ ہو جانا ہی تمام مذاہب کا بنیادی مقصد رہا ہے۔ قرآن اس رویئے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا کہ ہم دنیا سے بالکل کٹ کر اللہ سے لو لگالیں۔ اس کے برعکس' قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا اور اس کی ہر شے مقدس اور متبرک بن جاتی ہے بشرطیکہ ہم آخرت کی فلاح کو اپنا مقصد بنا لیں۔ ایک مومن سے تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ دنیا میں بھرپور طریقے سے زندگی گزارے اور کامیابی کے حصول کے لئے پوری کوشش کرے۔ دنیا اور آخرت کے درمیان کوئی بنیادی تضاد نہیں ہے بشرطیکہ انسان دنیا کی زندگی کو آخرت کے لئے گزارنا سیکھ لے! لیکن آخرت کے لئے جینا اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان اپنی فطرت میں موجود "راہبانہ" داعیہ کو ایک حد تک پروان چڑھالے۔ یہ شے ہمیں روزے کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے جس میں ہم مقررہ اوقات کے اندر حلال چیزوں سے بھی اپنے نفس کو روک لیتے ہیں۔

روزے کا مقصد تقویٰ کا حصول ہے' اور تقویٰ وہ شے ہے جو اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ جاتا ہے۔ دوسری طرف قرآن وہ رسی ہے جو اللہ اور بندے کے مابین تنی ہوئی ہے۔ رمضان ہی میں وہ رات یعنی لیلتہ القدر بھی ہے جس میں قرآن نازل ہوا' اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی ہدایت سے فائدہ اٹھانے کی بنیادی شرط تقویٰ ہے۔ روزے اور قرآن کا قریبی تعلق ان حقائق پر غور کرنے سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان کے مہینے میں تلاوت قرآن اور خصوصاً قیام الیل میں قرآن پڑھنے اور سننے پر خاص زور دیا گیا ہے۔ روزہ گزشتہ انبیاء کی شریعتوں میں بھی فرض کیا گیا تھا' اور قرآن کی رو سے گزشتہ صحیفوں میں آج بھی "نور" موجود ہے۔ تاہم یہود و نصاریٰ کے لئے یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ روزے رکھ کر وحی آسمانی کی تلاوت کر سکیں' اس لئے کہ ان کی آسمانی کتابیں اپنی اصل حالت اور اصل زبان میں موجود ہی نہیں ہیں۔ آج صرف قرآن حکیم ہی واحد آسمانی کتاب ہے جو اپنے اصل عربی متن کے ساتھ محفوظ ہے۔

مکہ سے مدینہ ہجرت کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ نے دو اقدامات کئے جن کا براہ راست تعلق مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ کے تعلقات سے تھا۔ اولاً آپؐ یروشلم کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے جو یہودیوں اور عیسائیوں کا قبلہ تھا' اور ثانیاً آپؐ نے یہود کے ساتھ تورات کے قانون کے مطابق روزے رکھنا شروع کئے (یاد رہے کہ یہود کے ہاں سحری نہیں کھائی جاتی)۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کے ان اقدامات سے اہل کتاب کو اس امر کا قائل بنانا مقصود تھا کہ آپؐ بھی وہی تعلیم لے کر تشریف لائے ہیں جن کی انبیائے بنی اسرائیل تبلیغ فرماتے رہے تھے۔ واللہ اعلم! ہجرت کے بعد پورے ۱۷ مہینے اس حال میں گزرے یہاں تک کہ یہودیوں کے ربّی اور عالم حضرت عبداللہ بن سلامؓ ایمان لے آئے' اور یہی یہود مدینہ کے لئے فیصلے کی گھڑی تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ تورات کی پیش گوئیوں کے مطابق حضور ﷺ کو نبیؐ موعود تسلیم کرتے' انہوں نے محض اس لئے انکار کر دیا کہ حضورؐ کا تعلق بنی اسرائیل سے نہیں بلکہ بنی اسمٰعیل سے تھا۔ اس کے بعد سے یہود کے دل کا حسد اور غصہ مسلمانوں کے خلاف ان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی شکل میں کھل کر سامنے آنے لگا۔

شعبان ۲ھ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبدیلی قبلہ کا حکم نازل ہوا' اور اس کے فوراً بعد رمضان کے روزے فرض کر دیئے گئے' جن کی تفصیلات شریعتِ موسویؑ کے روزوں سے مختلف تھیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کی راتوں میں تعلق زن و شو کو جائز قرار دیا۔ اس اجازت کی بدولت ایک خالص جسمانی اور حیوانی معاملے میں بھی روحانیت کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ دنیا میں بالعموم جنسی داعیہ کی تسکین کو اعلیٰ روحانی مقامات کے حصول میں رکاوٹ سمجھا گیا ہے' لیکن اسلام نے رمضان جیسے مہینے میں بھی اسے جائز رکھا ہے جب کہ انسان کی روحانی نشوونما پورے عروج پر ہوتی ہے۔ اسی سے اسلام کا فلسفہ ازدواج بھی ہمارے سامنے آتا ہے' جس کی رو سے جنسی خواہش اور شریعت کی حدود میں اس کی تسکین بجائے خود مقدس اور متبرک بن جاتے ہیں' اور مرد و زن کا تعلق جسمانی اور روحانی تسکین ہی نہیں بلکہ حقیقت مطلقہ تک پہنچنے کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کے ارشاد "میرے لئے تین چیزیں محبوب بنائی گئی ہیں : "عورت' خوشبو' اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے" کی ابن عربی نے یہی توجیہہ پیش کی ہے۔ ملاحظہ ہو "فصوص الحکم"۔

رمضان کے مہینے میں اللہ تعالیٰ نے مریضوں اور مسافروں کو یہ رعایت عطا فرمائی ہے کہ وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر شمار پورا کر لیں۔ اس رعایت کی وجہ سے احکام شریعت میں میانہ روی' آسانی' اور عملیت پسندی کا عنصر شامل ہو گیا ہے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اگر مذہبی احکام میں انسانوں کی عملی مجبوریوں اور کمزوریوں کا لحاظ نہ رکھا جائے تو ایسا مذہب اپنی کشش کھو دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اس ضمن میں کہتا ہے کہ اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے' مشکل اور دشواری نہیں چاہتا۔ دوسری طرف وہ افراد جو بہت بڑھاپے یا کسی مستقل بیماری کی وجہ سے روزہ رکھنے کے قابل نہ رہے ہوں ان کے لئے یہ راستہ کھولا گیا ہے کہ وہ روزے کے کفارے کے طور پر غرباء کو کھانا کھلائیں۔ اس حکم سے روزے کی معاشرتی جہت ہمارے سامنے آتی ہے۔ رمضان وہ مہینہ ہے جب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر سب سے زیادہ مہربان ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث کی رو سے اس مہینے میں جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں' رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے

ہیں' دوزخ کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور شیطانوں کو قید کردیا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق حضور اکرم ﷺ بھی رمضان المبارک میں خاص شفقت اور رحمت کا اظہار فرماتے تھے۔ اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ انفاق کرنا رمضان کی روح کا تقاضا ہے۔ روزہ اس وقت فرض کیا گیا جب مسلمان ہجرت کے بعد ایک منظم امت کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ ایک فرد کا ذاتی معاملہ ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعے معاشرے کے غریب اور کمزور طبقات کی حالت کو بہتر بنانا بھی مقصود ہے۔

قرآن کے مطابق ایک مسلمان کے ہاتھوں دوسرے مسلمان کے قتل خطا کا کفارہ ایک مومن غلام کو آزاد کرنا' اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو دو مہینے تک روزے رکھنا مقرر کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ غلاموں کو آزاد کرنا بھی اسی نوعیت کا روحانی عمل ہے جس طرح روزہ رکھنا' یہی وجہ ہے کہ دونوں کو برابر رکھا گیا ہے۔ غلاموں کی آزادی کی ترغیب و تشویق دے کر اور اس عمل کو بہت بڑی نیکی اور روحانی فعل قرار دے کر اسلام نے غلامی کے ادارے کو اس انداز میں ختم کیا جس کی بدولت آزاد شدہ غلاموں کا معاشرے میں جذب ہونا ممکن ہوا۔ امریکہ میں غلامی کو ختم ہوئے ایک صدی بیت چکی ہے' لیکن آزاد ہونے والے غلاموں کی اولاد آج بھی امریکی معاشرے کے مرکزی دھارے میں شامل نہیں ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں غلامی کے خاتمے کا اصل جذبہ محرکہ معاشی تھا نہ کہ روحانی یا اخلاقی! اسی طرح کا معاملہ ہندوستان میں ذات پات کے نظام کی وجہ سے پایا جاتا ہے۔ عیسائیت اور ہندومت دونوں مذاہب میں روزے اور احترام آدمیت کے درمیان کوئی تعلق موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مذاہب کے پیروکاروں کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ روزے سے حاصل ہونے والی روحانی قوت کو انسانوں کی معاشرتی حالت بہتر بنانے میں استعمال کر سکیں۔ اسلام کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایک مذہبی اور ذاتی فعل یعنی روزے کا تعلق خدمت خلق اور انسانی حریت و مساوات کے ساتھ قائم کر کے روحانی قوت کو وسیع معاشرتی بہبود کے لئے استعمال کیا ہے۔

۲۷/ رجب حضور اکرم ﷺ کی معراج کی تاریخ ہے' اور ۲۷/ رمضان کی رات

لیلتہ القدر ہے۔ ان دو راتوں کے درمیان کا عرصہ روحانی اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے جس میں اجتماعی روحانیت کا مسلسل ارتقاء ہوتا چلا جاتا ہے' یہاں تک کہ ایک اوسط درجے کے مسلمان کی انفرادی کوشش بھی اس اجتماعی روحانیت کی برکت سے اسے روحانی نشوونما کی راہ پر ڈال دیتی ہے۔

رمضان کے روزے نہ صرف روح بلکہ جسم کے لئے بھی فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ ان روزوں کی بدولت ہم جسم کی غیر ضروری چربی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں' بشرطیکہ سحر اور افطار میں قسم قسم کے مرغن کھانوں کا ضرورت سے زیادہ استعمال نہ کیا جائے۔ قوت کے حصول میں جسمانی صحت اور توانائی کا بھی اہم مقام ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کو بادشاہی عطا کرتے وقت فرمایا تھا کہ وہ اس مقام کے لئے اپنے علم اور جسمانی طاقت کی وجہ سے حقدار بنے ہیں۔ (البقرہ : ۲۴۷)

اسی طرح انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں بھی رمضان کے روزے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہم روزمرہ کی زندگی میں مقررہ اوقات میں ایک جیسے کام کرتے رہنے کی وجہ سے ایک نوع کی اکتا دینے والی یکسانیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ رمضان کے مہینے میں ہمارے کھانے پینے اور سونے جاگنے کے اوقات بڑی حد تک تبدیل ہو جاتے ہیں' یہاں تک کہ ہم اس مہینے میں ایک بالکل مختلف قسم کی زندگی گزارنے لگتے ہیں۔ اس تبدیلی کی وجہ سے نہ صرف جسم اور جسمانی نظام کو فائدہ پہنچتا ہے بلکہ ہر انسان میں خفتہ تخلیقی صلاحیتیں بھی ابھر کر سامنے آجاتی ہیں اور وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور پر نئے خیالات اور نئے تجربات کے لئے اپنے آپ کو تیار پاتا ہے۔

روزے کی بھوک اور پیاس برداشت کرنے کی بدولت ہمیں غرباء کی تکلیف کا ذاتی تجربہ حاصل ہوتا ہے' ہم ان کے لئے زیادہ ہمدردی محسوس کرتے ہیں اور ہمارے دلوں میں خیر کے کاموں اور انفاق کے لئے جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ اسی طرح روزے میں ہمارے اندر خوراک کی قدر کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے' اور ہم کھانے پینے کے معاملے میں اسراف اور ضیاع کی برائی کو ذاتی تجربے کی بنا پر سمجھنے لگتے ہیں۔

آج امتِ مسلمہ کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ "قوت" کو حاصل کرے۔ اسی کی

(باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ کیجئے)

نیکیوں کا موسم بہار

تحریر : مولانا محمد یوسف اصلاحی

"نیکیوں کا موسم بہار" قریب آ رہا ہے' اور جلد ہی اس کے مبارک شب و روز آپ پر سایہ فگن ہونے والے ہیں۔ آپ دن میں روزہ رکھیں گے' شب میں خدا کے حضور قیام کریں گے اور شب و روز کی مختلف ساعتوں میں کتاب الٰہی کی تلاوت کریں گے۔ صدقہ و خیرات کریں گے اور نیکیوں کے اس موسم بہار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ پھر مہینے بھر کی عبادت و ریاضت کے بعد عید کی مبارک صبح کو عید گاہ پہنچ کر دوگانہ شکر ادا کریں گے۔ اور اس حال میں اپنے گھر واپس آئیں گے کہ خدا فرشتوں میں اعلان کرے گا--- کہ "میں نے اپنے ان بندوں کو بخش دیا" اور آپ بخشے بخشائے اپنے گھروں کو واپس آئیں گے۔ مگر اس اجر و انعام کے مستحق بننے کے لئے ایک شرط ہے۔ اس شرط کا پورا کرنا ناگزیر ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ آپ کی یہ ساری عبادت و ریاضت شعور کے ساتھ ہو' آپ شعور کے ساتھ خدا کی کتاب کی تلاوت کریں' شعور کے ساتھ دن میں روزہ رکھیں' شعور کے ساتھ شب میں خدا کے حضور قیام کریں' اور شعور کے ساتھ راہ خدا میں خرچ کریں۔

شعور کے ساتھ جب آپ کتاب الٰہی کی تلاوت کریں گے تو اس سے شعوری عمل پیدا ہو گا اور جب شعور کے ساتھ آپ نیک اعمال میں سرگرم ہوں گے تو آپ اعمال صالحہ کی برکتیں اپنی زندگی میں عملاً محسوس کریں گے۔ پھر اعمال صالحہ کی برکتیں اور اچھے اثرات آپ کے قلب میں مزید اچھے جذبات پیدا کرنے میں معاون ہوں گے۔ اس طرح آپ کے لئے نیکی کی راہ آسان' کشادہ اور نہایت پر کشش بن جائے گی۔ خدا آپ کی مدد فرمائے۔

خدا کی کتاب پڑھتے ہوئے جب آپ اس آیت پر پہنچیں :

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ....﴾

"اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کر دیا گیا..."

تو یوں سوچئے کہ آپ کا رب آپ سے مخاطب ہے۔ جب وہ کہتا ہے : اے ایمان والو! تو کان لگا کر سنئے' یہ آپ کے رب کی آواز ہے' اور وہ کسی دوسرے کو نہیں آپ کو پکار رہا ہے۔ آپ کا نام لے کر پکار رہا ہے۔ آپ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں' مومن ہونے پر فخر کرتے ہیں' ایمان والوں میں یقیناً آپ بھی شامل ہیں اور آپ کا رب آپ سے ہی بات کر رہا ہے۔ سوچئے کا یہ انداز آپ کو کسی اور ہی عالم میں پہنچا دے گا۔ آپ کی روح پر وجد کی ایک کیفیت طاری ہو گی۔ آپ سوچیں گے : اللہ اکبر! میری یہ عظمت و اہمیت' کہ میرا رب مجھے میرا نام لے کر پکار رہا ہے' اور آپ ہمہ تن گوش ہو کر اگلے الفاظ دل کے کانوں سے سنیں گے۔ "تم پر روزہ فرض کر دیا گیا ہے" کے الفاظ پڑھتے ہوئے آپ یوں ہی سرسری انداز میں نہیں گزر جائیں گے' بلکہ یوں سوچیں گے کہ "تم پر" کا خطاب مجھ ہی سے ہے۔ گویا آپ کا رب آپ سے یہ کہہ رہا ہے : میرے بندے! یہ روزہ میں نے تجھ ہی پر فرض کیا ہے' دن بھر روزہ سے رہ کر تو میرے ہی حکم کی تعمیل کرتا ہے اور اس حکم کو بجالانے کے لئے تیرے واسطے اتنی بات کافی ہے کہ یہ اس خدا نے تجھ پر فرض کیا ہے جس پر تو ایمان لایا ہے۔ مومن کے لئے کسی حکم کی تعمیل کا یہ محرک بالکل کافی ہے کہ اس کے رب کا یہی حکم ہے اور اپنے رب کی اطاعت کے تصور کی لذت ایمان کا زبردست انعام ہے۔ اور پھر جب آیت کا اگلا فقرہ آپ پڑھیں گے تو اپنے رب کی بے پایاں رحمت و رافت اور شفقت و عنایت کا احساس کر کے آپ کا رواں رواں احساس شکر سے سرشار ہو جائے گا۔ ارشاد ہے :

﴿کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ....﴾

"جس طرح ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے گزرے ہیں"۔

یعنی یہ روزہ کوئی بوجھ نہیں ہے جو خدا نے تم پر لاد دیا ہو' بلکہ یہ تمہاری شخصیت کی تعمیر' تمہاری تربیت اور تزکیہ نفوس کے لئے خدا کی ایک نعمت اور ناگزیر ذریعہ ہے--- اسی لئے تو خدا نے اسے ہر دور میں' ہر نبی کی امت پر فرض رکھا ہے۔ یہ تربیت و تزکیہ کے

نظام کا ایسا ضروری جزو ہے' اس قدر زبردست مؤثر عامل ہے کہ خدا کی کوئی شریعت کبھی اس سے خالی نہیں رہی۔ تم پر روزہ فرض کر کے خدا نے تم پر اپنی رحمت و عنایت کا اہتمام کیا ہے اور تمہیں اس نعمت سے نواز کر اپنی رضا اور اجر آخرت کا مستحق بننے کا تمہارے لئے موقع فراہم کیا ہے۔

"جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا" ---- یہ الفاظ محض تاریخ بیان کرنے کے لئے نہیں ہیں' قرآن کا موضوع محض تاریخی داستانیں بیان کرنا نہیں ہے---- دراصل اُن الفاظ کے ذریعے روزے کی عظمت و اہمیت اور تربیت و تزکیہ کے نظام میں اس کی غیر معمولی اہمیت کو واضح کرنا ہے کہ ہر نظام تربیت اور شریعت میں ہمیشہ روزہ موجود رہا ہے۔ اور پھر اگلے فقرے میں روزے کا اصل حاصل بتا کر بات پوری کر دی گئی ہے : ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (البقرہ ۲ : ۱۸۳) "تا کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو" یعنی خدا نے روزے کا حکم خود تمہارے ہی فائدے کے لئے دیا ہے' تمہاری عبادتوں سے خدا کا اپنا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ خدا تو بے نیاز ہے۔ ساری کائنات مل کر ہمہ وقت اس کی عبادت میں لگی رہے اور کائنات کے کسی چپے میں کسی لمحے بھی اس کی نافرمانی نہ ہو تو بھی اس سے اس کی ذات اقدس کو ذرہ برابر فائدہ نہ ہو گا۔

روزہ اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ بندہ تقویٰ کا پیکر بن جائے۔ اس کے دل میں وہ غیر معمولی قوت پیدا ہو جائے کہ نیکی کی راہ پر بڑھنا اور دوڑنا اس کے لئے آسان اور برائی کی راہ پر جانا اس کے لئے دشوار ہو جائے---- تقویٰ ہی دراصل زندگی کی اصل رونق اور بہار ہے۔ تقویٰ دل کی وہ روشن کیفیت ہے جس کے ذریعے آدمی پر ہدایت کی راہ کھلتی ہے' جس کی بدولت آدمی خدا کی کتاب سے فیض پانے کے لائق بنتا ہے۔ تقویٰ وہ پسندیدہ جوہر ہے جس کی بنیاد پر خدا نیک اعمال کو تقویت بخشتا ہے۔ غیر متقی انسان کا عمل بھی خدا کے یہاں مقبول نہیں ہوتا۔ اور روزہ رکھنے کا حاصل یہی ہے کہ آدمی کو تقویٰ کی یہ دولت حاصل ہو۔ بے شک دوسری عبادات سے بھی تقویٰ حاصل ہوتا ہے' مگر روزے کو تقویٰ سے خصوصی مناسبت ہے اور اسی لئے خدا نے تقویٰ کو روزے کا حاصل قرار دیا ہے۔

اب پوری آیت کو ایک بار پھر ذہن میں تازہ رکھئے اور اپنا جائزہ لیجئے کہ جب "اے

ایمان والو!" کے الفاظ آپ پڑھتے اور سنتے ہیں تو آپ پر وجد کی کوئی کیفیت طاری ہوتی ہے یا نہیں' خدا کی عظمت اور ہیبت سے آپ پر لرزہ طاری ہوتا ہے یا نہیں---اور آپ دل کی گہرائی سے یہ احساس کرتے ہیں یا نہیں کہ خدا آپ سے مخاطب ہے اور آپ پر روزہ فرض کر رہا ہے' اور پھر یہ کہ روزہ رکھنے کے لئے یہ بات آپ کے لئے کافی ہو جاتی ہے کہ یہ آپ کے خدا کا حکم ہے یا آپ کسی اور محرک کے بھی منتظر رہتے ہیں۔ اگر خدا کے حکم کے علاوہ آپ کسی اور محرک کے بھی منتظر رہتے ہیں اور کسی عمل پر آمادہ کرنے کے لئے آپ کو خدا کا حکم کافی نہیں ہوتا' تو آپ ایک خطرناک اور تباہ کن بیماری کا شکار ہیں۔ آپ کا ایمان نزع کی کش مکش میں مبتلا ہے۔ جلد از جلد فکر کیجئے اور اپنے ایمان کو اس کش مکش سے بچایئے۔ اس معاملے میں سستی اور غفلت اور لاپروائی آپ کی عبرتناک موت کا باعث بن سکتی ہے---جسمانی موت نہیں کہ وہ تو ایک بار آتی ہی ہے---اور وہ کوئی حادثہ نہیں' حادثہ تو ایمانی موت ہے۔ ایمان مردہ ہو گیا تو سب کچھ لٹ گیا۔ ایمان سے محروم زندگی' زندگی نہیں موت ہے۔ ایسا چلتا پھرتا انسان دراصل ایک زندہ لاشہ ہے جو زمین کی پیٹھ پر ایک گندا بوجھ ہے۔

جس بندے کا ایمان شعوری ایمان ہے' اس کو خدا کی اطاعت پر آمادہ کرنے کے لئے اتنی بات بالکل کافی ہے کہ اس کے خدا نے اسے یہی (عبادت) کا حکم دیا ہے۔ یہ تو ربِّ جلیل و کریم کی بے پایاں عنایت اور مزید فضل و کرم ہے کہ وہ حکم دینے کے ساتھ ساتھ اپنے حکم کے اسباب اور فرض کردہ عبادات کے فائدے بھی ذہن نشین کراتا ہے۔

روزے کے سلسلے میں فرمایا گیا" تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو"۔ یہ فقرہ اس لئے بھی ہے' کہ بندۂ مومن اور زیادہ دل جمعی اور یکسوئی' اطمینان قلب اور نشاط کے ساتھ روزے کا اہتمام کرے اور خاص طور پر اس لئے بھی کہ بندہ بار بار اپنا جائزہ لے اور دیکھے کہ اس کا روزہ واقعی اس کا روزہ بھی ہے یا نہیں۔ "تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو" یہ الفاظ ایک کسوٹی بھی ہیں' تاکہ ہر روزہ رکھنے والا شخص اپنی زندگی پر نگاہ رکھے اور جائزہ لیتا رہے کہ روزہ رکھ کر اس کی زندگی تقویٰ سے آراستہ ہو رہی ہے یا نہیں۔

خدا نے تقویٰ کو روزے کا حاصل بتایا ہے اور خدا کا یہ فرمان یقیناً ہر شک و شبہ سے

پاک ہے۔ روزے سے یقیناً تقویٰ حاصل ہوتا ہے اور ہونا چاہئے--- لیکن اگر کوئی روزہ رکھنے کے باوجود تقویٰ سے محروم ہے تو یقین کرلینا چاہئے کہ اس کا روزہ وہ روزہ نہیں ہے' جس کا خدا نے حکم دیا ہے۔ اگر روزہ رکھ کر آپ کو تقویٰ کی دولت نہیں حاصل ہو رہی ہے تو اطمینان کرلیجئے کہ آپ روزہ سے نہیں ہیں' آپ فاقہ کی مشق کر رہے ہیں جس کا حاصل تقویٰ نہیں کمزوری ہے۔

بے چینی کے ساتھ فکر کیجئے---- رمضان کی مبارک گھڑیاں تیزی کے ساتھ گزر جائیں گی۔ انہیں اس طرح نہ گزر جانے دیجئے کہ آپ خالی ہاتھ رہیں---- معلوم نہیں آئندہ سال آپ کو پھر یہ مبارک گھڑیاں زندگی میں نصیب ہوتی ہیں یا نہیں؟

بقیہ : عہد حاضر میں اجتہاد

Constitutional set up کیا ہے؟ ہماری تاریخ کے چودہ سو سالوں میں اجتہاد کس طور سے ہوتا رہا ہے اور اب اگر اسلامی ریاست وجود میں آئے گی' اور اللہ کرے کہ آئے' تو پھر اس میں اجتہاد کی کیا شکل ہوگی؟ اس پر ان شاء اللہ آئندہ گفتگو ہوگی۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات OO

(مرتب : حافظ خالد محمود خضر)

بقیہ : روزے کی عبادت

بدولت دشمنوں کو مرعوب کرنا' مظلوموں کی دادرسی کرنا' اور اسلام کی حقانیت کو دنیا کے سامنے مبرہن کرنا ممکن ہو سکے گا۔ سیرت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مکی دور میں "قوت" کی بنیادیں استوار کی گئیں' یعنی آزادی' علم' اخلاقی اقدار' ایمان' نظم' اخوت اور صالح قیادت' اور اس کی بدولت وہ "قوت" حاصل ہوئی جس کی برکت سے مسلمانوں نے بدر میں کفار کو شکست دی۔ آج بھی اس امر کی انتہائی شدید ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ مسلمان اس "قوت" کو دوبارہ حاصل کریں۔ رمضان کے روزے ہمیں اسی مقصد کے حصول کا راستہ دکھاتے ہیں۔OO

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS &
SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS,
FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS
NTN
BEARINGS

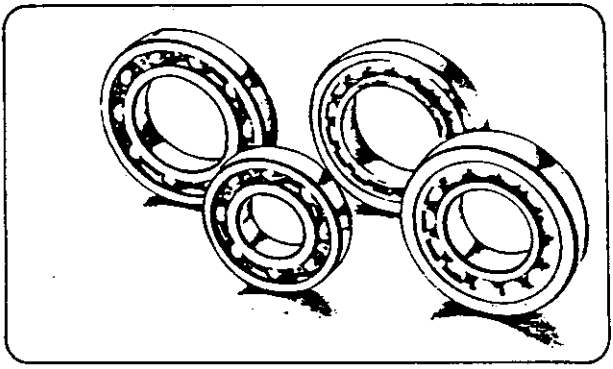

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65,
Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) Amin Arcade 42,
Brandreth Road, Lahore-54000
Ph : 54169

GUJRANWALA : 1-Haider Shopping Centre, Circular Road,
Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

عبادتِ رب

از قلم : رحمت اللہ بٹر' مرکزی ناظم تربیت

الحمد للّٰہ ربِّ العالمین' والصلوٰۃ والسلامُ علٰی سید الانبیاء والمرسلین' اما بعد :

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ـ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝﴾ (الذاریات : ۵۶)

قافلہ تنظیم اسلامی میں شمولیت کے بعد یہ احساس بیدار ہوا کہ بحیثیت مسلمان ہم میں سے ہر ایک پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کرے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کے تعلق سے دین کے وہ فرائض ادا کرے جو اس پر عائد ہوتے ہیں۔ نتیجتاً قرآن مجید کی طرف رغبت بڑھی اور اس کا مطالعہ ہونے لگا۔ بہت سی حقیقتیں تو محترمی و مربی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ کے دروس سے منکشف ہوئیں لیکن بعض کی طرف قرآن مجید نے از خود رہنمائی کی۔ ان حقائق میں سے ایک حقیقت "عبادتِ رب" ہے۔ عبادت اور رب کا تعلق اور پھر بندگی کے تقاضے ایک ترتیب سے ذہن میں ایسے سمائے کہ بہت سے اشکالات خود بخود حل ہو گئے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کے ذریعے جو فرائض دینی کا تصور علیحدہ علیحدہ اصطلاحات کے ذریعے سامنے آیا تھا وہ ایک نئی ترتیب سے واضح ہوا کہ یہ سوال باقی ہی نہ رہے کہ آیا عبادتِ رب کے ساتھ کہ شہادتِ حق اور اقامتِ دین بھی ہر مسلمان کے فرائض میں شامل ہیں یا نہیں۔ جب راقم الحروف نے تربیت گاہوں میں "فرائض دینی کا جامع تصور" کے موضوع پر لیکچر دینا شروع کیا تو اسی ترتیب کے ساتھ رفقاء کے سامنے بات رکھنے کی کوشش کی۔ اب تحریر کے ذریعے کوشش کر رہا ہوں کہ اس فکر کو عام کروں۔ تحریر و تصنیف کے ضمن میں اپنی بے بضاعتی کا احساس ہے' لیکن اللہ کے بھروسے پر اس کام کا آغاز کر دیا ہے۔ وللّٰہ التوفیق فی

الاولیٰ والآخرۃ

سورۂ یٰسین میں اللہ تعالیٰ نے پیشگی آگاہ کر دیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان انسانوں سے باز پرس کریں گے جنہوں نے اللہ کی عبادت پر اپنی زندگی نہ گزاری ہوگی۔

﴿ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَلَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴾

(یٰسٓ : ۶۰-۶۱)

"اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت مت کرو کیونکہ وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے' اور یہ کہ تم میری ہی بندگی کرو۔ یہ سیدھا راستہ ہے"۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی کوئی ایسا عہد ہے جو ہم نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا جس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ قرآن مجید اس بات کا جواب اثبات میں دیتا ہے کہ ہاں ایسا ہوا تھا۔ چنانچہ سورۃ الاعراف میں اس کا بڑے اہتمام سے ذکر کیا گیا ہے :

﴿ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۚ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ ﴾

(الاعراف : ۱۷۲-۱۷۵)

"(یاد کرو) جب تیرے رب نے نسل آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکال کر ان کو خود ان کی جانوں پر گواہ ٹھہرایا اور پوچھا : کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ (اس پر) تمام انسانوں نے اقرار کیا : کیوں نہیں! ہم اس پر گواہ ہیں۔ (ہم نے یہ عہد اس لئے لیا کہ) مبادا تم قیامت کے دن یہ کہہ دو کہ ہم اس سے غافل تھے یا یہ کہ ہمارے باپ دادا نے شرک کیا ہم سے پہلے' اور ہم ان کی اولاد تھے (اس لئے ہم بھی مشرک ہو گئے) تو کیا تو ہمیں ان غلط کار لوگوں کی وجہ سے ہلاکت میں ڈالے گا؟ ہم اس طرح کھول کھول کر اپنی آیات کو بیان کر رہے ہیں تاکہ وہ ہماری

طرف رجوع کریں"۔
گویا اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طرف سے پیش کئے جانے والے دونوں بہانوں کو رد کرنے کے لئے یہ عہد لیا تھا۔ ایک یہ کہ وہ کہہ دیں کہ ہمیں تو کسی نے بتایا ہی نہیں کہ ہمارا رب کون ہے اس لئے ہم کس کی بندگی کرتے، اور دوسرے یہ کہ آباء پرستی یا تقلید یا زمانے کے چلن کا عذر بھی نہ رہے کیونکہ عہد ہر انسان سے فرداً فرداً لے لیا گیا۔
اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ عہد تو اللہ کے رب ہونے کا لیا گیا لیکن بازپرس اس پر کی جارہی ہے کہ میری بندگی کیوں نہیں کی۔ اور اسی کو تمام جنوں اور انسانوں کی تخلیق کی غایت بھی قرار دے دیا گیا ہے :

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۝﴾

(الذاریات : ۵۶)

"میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں"۔
دوسرا سوال جو فوراً ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں تو یہ عہد یاد ہی نہیں ہے اس لئے ہم اس کے تقاضے کیسے پورے کریں۔
پہلی بات یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ عہد یاد رکھنے والا نہیں ہے بلکہ اس کا مظہر وہ فطرت ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے، اور یہ فطرت تبدیل نہیں ہوتی۔ چنانچہ اسی فطرت کا تقاضا ہے کہ انسان جس کو بھی اپنا رب مانتا ہے اس کی بندگی لازماً کرتا ہے۔ چنانچہ سورۂ روم میں فرمایا گیا :

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا، لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾ (الروم : ۳۰)

"پس اپنے رخ کو اللہ کی اطاعت پر یکسو کر لو۔ یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اور اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی"۔
یہی حقیقت ہے جس کو نبی اکرم ﷺ نے بایں الفاظ بیان فرمایا ہے :

((مَا مِن مَولُودٍ الا يُولَدُ عَلَى الفِطرَةِ، فابَوَاهُ يهوِّدانه او يُمَجِّسانه او يُنَصِّرانه)) (وفی روایہ "او يُشرِّكانه")

"ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے (یعنی فطرت اسلام پر) پھر اس کے والدین اسے

یہودی' مجوسی یا نصرانی بنادیتے ہیں"۔ (ایک اور روایت میں آیا ہے کہ "یا اسے مشرک بنادیتے ہیں۔")

اب آیئے پہلے سوال کی طرف۔ یہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے رب کی بندگی کرے۔ لیکن رب کہتے کسے ہیں؟ عربی میں رب کے بنیادی معنی مالک کے ہیں۔ جیسے رَبُّ الدَّار : گھر کا مالک' رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالارض : آسمانوں اور زمین کا مالک۔ سورۂ قریش میں خاص طور پر یہ لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے اور اسی بنیاد پر قریش مکہ سے بندگی کا تقاضا کیا گیا ہے :

﴿فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوعٍ وَّآمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝﴾ (قریش : ۳'۴)

"ان کو بندگی کرنی چاہئے اس گھر کے مالک کی جس نے انہیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور انہیں خوف سے بچا کر امن عنایت کیا"۔

حقیقت یہ ہے کہ یہی دو صفات یا ذمہ داریاں ہیں جو ہر مالک کی ہوتی ہیں۔ یعنی جس کا وہ مالک ہے اس کی پرورش کا سامان مہیا کرے اور اس کی حفاظت کا بندوبست کرے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن مجید انسانوں کے ذہن نشین کرواتا ہے کہ وہ اپنے مالک حقیقی کو پہچانیں تاکہ وہ اس کی بندگی کریں۔ چنانچہ قرآن مجید کے شروع ہی میں انسانوں سے جو بندگی کا تقاضا کیا گیا ہے وہ اسی بنیاد پر کیا گیا ہے :

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَاءَ بِنَاءً وَّأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَندَادًا وَّأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝﴾ (البقرہ : ۲۱-۲۲)

"اے انسانو' بندگی کرو اپنے مالک کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں' تاکہ تم بچ جاؤ۔ (وہ مالک) جس نے زمین کو تمہارے لئے بچھا دیا ہے اور آسمان کو چھت بنایا ہے اور پھر اس نے بلندی سے پانی نازل کیا ہے اور اس کے ذریعے سے تمہارے لئے پھلوں میں سے رزق مہیا کیا

ہے۔ پس (اس کی بندگی میں) کسی کو اس کا ہمسر نہ ٹھہراؤ اور یہ حقیقت تم جانتے ہو (کہ رزق مہیا کرنے والا وہی ہے)"۔

دیکھئے کس طرح قرآن مجید نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے :

﴿ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِی كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ ﴾

(ھود : ٦)

"اس زمین پر کوئی جاندار نہیں ہے مگر اللہ کے ذمہ ہے اس کا رزق (اس لئے) وہ ہر مخلوق کی جائے قرار کو جانتا ہے اور اس کے لوٹنے کی جگہ کو بھی جانتا ہے۔ یہ سب کچھ واضح طور پر لکھا ہوا ہے"۔

اسی طرح فرمایا :

﴿ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ... ﴾

(النحل : ۷۱)

"اور اللہ ہی ہے جس نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری عطا کی ہے"۔

اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو بار بار قرآن مجید میں دہرایا گیا ہے کہ :

﴿ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ۝ ﴾ (بنی اسرائیل : ۳۰)

"بیشک تیرا رب کشادہ کر دیتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ناپ تول کر دیتا ہے۔ بے شک وہ خوب باخبر ہے اپنے بندوں سے، اور ان کو دیکھ رہا ہے"۔

اس معاملے میں انسان کو خاص طور پر مخاطب کر کے فرمایا :

﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۚ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۚ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ ﴾

(بنی اسرائیل : ۳۱)

"اپنی اولاد کو رزق کی تنگی کے ڈر سے قتل نہ کرنا، کیونکہ ہم رزق دینے والے ہیں ان کو بھی اور تمہیں بھی"۔

تم جب آئے تھے تو کونسی ضمانت لے کر آئے تھے کہ تمہیں رزق مل جائے گا اور اب اوروں کے لئے فکر مند ہو۔

چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ انسان جسے بھی اپنا روزی رساں' مشکل کشا اور محافظ سمجھتا ہے اسی کی بندگی کرتا ہے کیونکہ یہ اس کی فطرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعے انسانوں کو باور کرایا ہے کہ :

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَمْلِکُوْنَ لَکُمْ رِزْقًا' فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْہُ وَاشْکُرُوْا لَہٗ' اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ۝﴾ (العنکبوت : ۱۷)

"بیشک جن کی تم بندگی کرتے ہو اللہ کے سوا وہ تمہارے رزق کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ پس تم اللہ کے ہاں سے ہی رزق کے خواہاں بنو' اور پھر اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر بجالاؤ۔ اور یاد رکھو کہ تمہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (وہ پوچھ لے گا کہ اس کے دیئے ہوئے رزق کو اوروں کی طرف کیوں منسوب کیا اور پھر ان کی بندگی کیوں کی)"۔

اصل بات تو یہ ہے کہ رزق اور اجل کا معاملہ ایسا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لئے معین کر دیا ہے اور یہی دو خطرات ہیں جن کے بارے میں انسان اپنے مالک حقیقی کو چھوڑ کر دوسروں کو ان کا مالک و مختار سمجھ لیتا ہے تو ان کی طرف رجوع کرتا ہے اور ان باطل ارباب سے اپنے لیے روزی اور حفاظت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر ان ہی کا بندہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ :

﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰہُ رَبُّہٗ فَاَکْرَمَہٗ وَنَعَّمَہٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَکْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰہُ فَقَدَرَ عَلَیْہِ رِزْقَہٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَھَانَنِ ۝﴾ (الفجر : ۱۵-۱۶)

"انسان کا معاملہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس کو آزماتا ہے اور اسے دنیا کی آسائشوں سے نوازتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت بخشی ہے' اور جب وہ آزمائش کے لئے اس پر رزق میں تنگی کرتا ہے تو پکار اٹھتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا ہے۔"

حالانکہ دونوں کیفیتوں کا معاملہ صرف انسان کی آزمائش کے لئے ہے کہ وہ اس اجل معین کو کیسے گزارتا ہے اور اس رزق کو کس طرح حاصل کرتا ہے۔ آیا اللہ کو رب مان کر جائز طریقے سے محنت کرتا ہے یا بجائے خود مالی وسائل کو رازق سمجھ کر جائز و ناجائز ہر طرح کے ذرائع سے رزق حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بس یہی وہ فرق ہے جو اس کی زندگی کے بارے میں انسان کے تصور میں واقع ہوتا ہے۔ پھر وہ اسی تصور کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ اگر کسی کو یہ یقین ہو جائے کہ رازق اور زندگی کی مہلت دینے والا صرف مالک کائنات ہے تو پھر وہ اللہ کے سوا کسی اور کا بندہ نہیں بنتا' اور اپنی عزت نفس کسی بھی قسم کی لالچ میں آکر نہیں بیچتا' بلکہ ہر مشکل میں اپنے مالک حقیقی کی طرف رجوع کرتا ہے اور صابر و شاکر ہو کر زندگی گزارتا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جس کے بارے میں آنحضور ﷺ نے فرمایا :

((عجبًا لامرِ المُؤمنِ' اِنّ امرَہ' کلَّہ' خَیر' ولیس ذٰلک لاحدٍ الّا لِلمؤمن 'اِنْ اصابتہُ سرّاءُ شکرَ فکان خیرًا لہ' واِن اصابتہ ضرّاءُ صبَر فکان خیرًا لہ)) (رواہ مسلم)

"صاحب ایمان انسان کا معاملہ بڑا عجیب ہے اور یہ صرف مومن ہی کے لئے ہے' کہ اگر اسے آسائش میسر ہوتی ہے تو شکر کرتا ہے پس یہ اس کے لئے بہتر ہے' اور اگر کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے' پس یہ بھی اس کے لئے بہتر ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ اس زندگی کے بارے میں اگر آگاہی ہو جائے اور پھر یہ آگاہی تازہ بھی رہے تو انسان بہت سے تفکرات اور نفس کے امانی اور بے جا خواہشات سے بچ جاتا ہے۔ قرآن مجید نے دنیا کی زندگی کو کھیل اور تماشے سے تشبیہ دی ہے۔ آج کا انسان اسے ڈرامے یا فلم کے حوالے سے خوب سمجھ سکتا ہے' جس میں ہر شخص کو صرف تین گھنٹے کے لئے کوئی کردار ادا کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اور یہ موقع اسے صرف اس کی کارکردگی جانچنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ اس کی کامیابی و ناکامی کا دارومدار اس کردار کی ادائیگی پر ہے نہ کہ اس حیثیت پر جس کے ذریعے اسے جانچا جاتا ہے۔ مثلاً کسی کو بادشاہ بنا دیا جاتا ہے اور کسی کو اس کا خادم' کسی کو جاگیردار اور کسی کو اس کا مزارع اور ہاری۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ

یا خادم اور جاگیردار یا نوکر حقیقتاً نہ بادشاہ ہوتا ہے نہ خادم۔ اداکاروں کو انعامات بادشاہ یا نوکر ہونے کے اعتبار سے نہیں بلکہ پرفارمنس کے لحاظ سے ملتے ہیں۔ یہی معاملہ اس دنیا کی زندگی کا ہے۔ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف انسانوں کو مختلف کردار دیئے ہیں۔ انسانوں میں یہ فرق و تفاوت حقیقی نہیں بلکہ محض امتحانی ہے۔ ہاں اصل فضیلت اور حقیقی مراتب وہ ہوں گے' جو وہ اپنے اعمال کے ذریعے کمائیں گے' از روئے الفاظ قرآنی :

﴿ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيلًا ۝ ﴾ (بنی اسرائیل : ۲۱)

"دیکھئے ہم نے کس طرح بعض کو بعض پر فضیلت دے رکھی ہے (لیکن یہ فضیلت عارضی اور صرف آزمائش کے لئے ہے) اصل درجہ بندی اور فضیلت تو آخرت کی ہے (جو ہر شخص خود محنت کر کے حاصل کرے گا)"۔

یہ حقیقت بھی سامنے رہنا چاہئے کہ اس دنیا میں اللہ نے جس شخص کو جہاں اور جن حالات میں پیدا کیا ہے اس میں اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے' بلکہ یہ تو وہبی ہے۔ لیکن پھر اس دنیا میں اپنے مالک کو پہچان کر اور اس زندگی کی حقیقت کو جان کر اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حق ادا کرنے میں اس کے لئے کامیابی ہے اور یہ امتحانی وقفہ غفلت اور مالک کی نافرمانی میں گزار دینے کا نتیجہ نامرادی ہے۔ جان لیجئے کہ انسان اس دنیا میں ان سے بھی یہی کچھ چاہتا ہے جن کا اسے مالک مجازی بنا دیا گیا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص نے کوئی جانور گھر میں رکھا ہوا ہو تو وہ حقیقتاً خود کو اس کا مالک گردانتا ہے۔ چنانچہ کبھی اس سے پوچھئے کہ یہ جانور کس کا ہے تو وہ فوراً کہے گا یہ میرا ہے۔ یعنی اس کا مالک میں ہوں۔ چنانچہ وہ اس جانور کے لئے خوراک مہیا کرنے اور اس کی حفاظت کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے اور اس ذمہ داری کو نبھاتا بھی ہے۔ لیکن اس جانور کی پرورش اور حفاظت کا سامان کرنے کے بعد وہ اس پر اپنا یہ حق بھی سمجھتا ہے کہ وہ جانور اپنا مقصد پورا کرے۔ اگر وہ جانور مالک کی مرضی پر نہ چلے تو اسے غصہ آتا ہے' اور وہ جانور کو سزا دینے سے بھی نہیں چوکتا۔ ایسا اس لئے ہے کہ وہ اسے مالک کا حق سمجھتا ہے کہ اس کا غلام اس کا فرمانبردار ہو اور وہ حقِ بندگی ادا کرے۔ چنانچہ یہی وہ مطالبہ ہے جو مالک کائنات ہر انسان کے سامنے قرآن مجید میں رکھتا ہے اور

اسے صرف اپنی عبادت کا حکم دیتا ہے :

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ ﴾ (البقرہ : ۲۱-۲۲)

"اے انسانو' بندگی کرو اپنے مالک کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں' (یہ بندگی اس لئے کرو) تا کہ تم (اس کی سزا سے) بچ پاؤ۔ (تمہارا مالک وہی ہے) جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھا دیا ہے اور آسمان کو چھت بنا دیا ہے اور پھر بلندی سے پانی برساتا ہے جس کے ذریعے تمہارے لئے روزی کا سامان کر رہا ہے۔ پس اللہ کے ساتھ کسی کو (بندگی میں) ہم سر نہ بناؤ اور یہ تم جانتے ہو (کہ مالک وہی ہے)"۔

خود نبی اکرم ﷺ کے ذریعے قریش مکہ کو یاد دلایا گیا کہ تمہیں تو بس اس گھر کے مالک کی بندگی کرنی چاہئے جو تمہارا رازق ہے جبکہ تمہاری بستی ایسی بے آب و گیاہ ہے کہ یہاں کچھ بھی نہیں پیدا نہیں ہوتا' لیکن اس نے کس طرح تمہارے لئے میوہ جات کا بندوبست کر رکھا ہے۔

قرآن مجید اس کائنات کے حقائق کی شہادت کی بنیاد پر جو بات انسانوں کو ذہن نشین کرانا چاہتا ہے وہ یہی ہے کہ اس کائنات کا مالک ایک ہی ہے' اور وہی تمہارا رب ہے' سورۂ عنکبوت میں فرمایا :

﴿ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۝ ﴾ (آیت ۳۶)

"اگر آپ ان سے پوچھیں بھلا آسمانوں سے بارش کون برساتا ہے جس کے ذریعے وہ مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے' تو یہ تسلیم کریں گے کہ وہ تو اللہ ہی ہے۔ تو پھر فرما دیجئے سارا شکر اللہ ہی کے لئے ہے (جو رازق ہے) لیکن ان کی اکثریت ان باتوں پر دھیان نہیں دیتی"۔

سورۂ انعام میں فرمایا :

﴿بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰی یَکُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَکُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ وَّهُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○ ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ ○﴾ (آیات ۱۰۲۔۱۰۳)

"وہ پہلی بار وجود بخشنے والا ہے آسمانوں اور زمین کو۔ کہاں سے ہوگا اس کا بیٹا جبکہ اس کی بیوی ہی نہیں ہے۔ اس نے تخلیق کی ہر چیز' اور وہ ہر شے کا علم رکھنے والا بھی ہے۔ یہ ہے تمہارا مالک۔ کوئی نہیں ہے عبادت کے لائق مگر وہی ہے۔ وہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے۔ پس اسی کی بندگی کرو۔ اور وہی ہر چیز کا کارساز ہے"۔

اسی طرح سورۃ المومن میں فرمایا :

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ فَتَبٰرَکَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ○﴾

(آیت ۶۶)

"اللہ وہ ذات ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے ٹھہرنے کی جگہ بنایا اور آسمان کو (حفاظت کے لئے) چھت بنایا اور پھر تمہیں صورتیں دیں' پس کیسی اچھی شکلیں بنائیں تمہاری۔ اور پھر اس نے پاکیزہ چیزوں سے تمہارے لئے رزق کا بندوبست کیا۔ یہ ہے تمہارا مالک' پس کتنا برکت والا ہے مالک تمام جہانوں کا"۔

نیز فرمایا :

﴿قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ یَّمْلِکُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَمَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ فَذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ ○﴾ (یونس : ۳۱۔۳۲)

"(ان مشرکین سے) پوچھئے کون ہے جو تمہیں رزق مہیا کرتا ہے آسمان سے اور زمین سے۔ کون ہے جو دینے والا ہے کان اور آنکھیں' اور کون نکالتا ہے زندہ کو

مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے۔ اور کون ہے جو تدبیر کرتا ہے کاموں کی؟ پس یہ کہیں گے کہ یہ تو اللہ ہی ہے۔ پس فرمادیجئے تو کیا تم (اس کی نافرمانی سے) بچتے نہیں ہو؟ پس یہ ہے تمہارا مالک حقیقی۔ پس حق کے علاوہ تو گمراہی ہی ہوتی ہے' پس کہاں بھٹکتے پھرتے ہو"۔

قرآن مجید کیوں اس حقیقت کو بار بار سامنے لا رہا ہے؟ صرف اس لئے کہ انسان اپنے مالک حقیقی کو پہچان لے تا کہ وہ بندگی اسی کی کرے۔ جیسے فرمایا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے "اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ O" اے لوگو! بے شک اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی' پس بندگی اسی کی کرو' اور یہی سیدھا راستہ ہے۔

اب آیئے اس دور کے اس مغالطے کی طرف کہ جس کی وجہ سے ہماری زندگیاں دو رنگی کا شکار ہیں کہ ہم اللہ کو رب مانتے ہوئے بھی اس کی فرمانبرداری نہیں کر رہے اور اس کی عبادت کا پورا حق ادا نہیں کر رہے۔ پہلے تو لیجئے ان انسانوں کا معاملہ جو زبان سے تو اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے' لیکن ان کی زندگیوں میں اس کی شہادت نہیں ملتی کہ وہ واقعی اللہ کے بندے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں تو صد فی صد یہی بات سچی ہے کہ ان کا اللہ کے رازق اور محافظ ہونے پر بالکل یقین نہیں ہے بلکہ وہ درحقیقت وسائل وذرائع ہی کو روزی رساں مانتے ہیں' یا اللہ کے سوا کچھ دوسری ہستیاں ہیں جن کے متعلق انہیں گمان ہے کہ ان کے قبضہ قدرت میں نفع و نقصان کا اختیار ہے۔

کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے اپنے ذریعہ معاش کو بھی اپنا رازق و محافظ سمجھ رکھا ہے' اور اس لئے وہ بڑی چاہت کے ساتھ اس کی بندگی کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ وہ اپنا وقت اور اپنی صلاحیتیں بھرپور طریقے پر اس کے لئے نچھاور کرتے ہیں۔ باقی رہا کبھی کبھار نماز روزہ تو بس ایک رسم کے طور پر وہ بھی ہے' ورنہ اللہ کے رب ہونے پر ان کو فی الواقع یقین کی کیفیت حاصل نہیں۔ اگر یہ یقین ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ وہ مالک کی رضا یا ناراضی کا خیال کئے بغیر اپنی روزی کے معاملے میں تو اپنا سب کچھ کھپا دیں' لیکن اللہ کی فرمانبرداری کے بارے میں انہیں کبھی خیال تک نہ آئے۔ انہیں احساس ہی نہ ہو کہ مالکِ

حقیقی نے کن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اور کن کو حلالی' کن برائیوں سے منع کیا ہے اور کن فرائض کا پابند کیا ہے' کن عبادات کو لازم کیا ہے اور کن لغویات سے روکا ہے۔ اگر انہیں اللہ کے رب ہونے کا یقین ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ ان کو اللہ کی پکار پر لبیک کہنے کی توفیق نہ ہو لیکن دکان وقت پر ضرور کھولیں' انہیں اللہ کی ناراضی کا ڈر نہ ہو لیکن اپنے دفتر کے انچارج یا فیکٹری کے مالک کے بے دام غلام ہوں' انہیں اللہ کی رضا کا خیال نہ آئے لیکن وہ جسے اپنا رازق سمجھے بیٹھے ہیں اس کی چشم و ابرو کے اشاروں کو بھی پہچانیں' اور ان کی خوشنودی کا کوئی موقع ضائع نہ جانے دیں۔

میں اپنی بات کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں جس کا بہت سے لوگوں کو تجربہ ہوا ہو گا۔ چند حضرات کہیں محفل میں بیٹھے ہوں اور اذان کی آواز آجائے اور ان میں سے کچھ مسجد جانے کے لئے اٹھیں' اور دعوت دیں کہ نماز کے لئے چلیں تو باقی حضرات کی زبان پر یہ الفاظ آجائیں گے کہ ہمارے لئے بھی دعا کرنا کہ ہم بھی نیک بن جائیں' لیکن انہیں خود نماز کے لئے جانے کی توفیق نہ ہو گی۔ دوسری طرف یہ حضرات صبح کسی کو نہیں کہتے کہ ہمارے لئے دعا کرنا کہ ہم دفتر چلے جائیں یا دکان کھول لیں' وہاں وہ خود بخوشی جائیں گے۔ محض اس لئے کہ ان کو اللہ کے رازق ہونے پر یقین نہیں ہے' اس لئے اس کے در پر کیوں جائیں؟ جہاں سے رزق حاصل ہونے کا یقین ہے وہیں تو جائیں گے! یہ ہے اصل معاملہ کہ ان کی اپنی فطرت انہیں مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنے اس "رب" کی فرمانبرداری کے تقاضے پورے کریں جسے وہ اپنا رازق سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے دل میں اصل مالک اور رازق حقیقی اللہ تبارک و تعالیٰ کے در پر جانے کے لئے آمادگی نہیں ہے کیونکہ اسے وہ مالک اور رازق مانتے ہی نہیں۔

اب دوسرے لوگوں کا جائزہ لیجئے۔ یہ وہ ہیں جن کو یقین ہے کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا بھی ایسی برگزیدہ ہستیاں ہیں جن کی خوشنودی حاصل کرنا اور جن کی اطاعت کرنا عبادت ہے' اس لئے کہ ان کے نزدیک ان ہستیوں کے ہاتھ میں رزق اور نفع و ضرر کا اختیار ہے۔ یہ لوگ بھی اپنے ان باطل ارباب کی عبادت کا حق ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے' لیکن کائنات کے اصل مالک کی انہیں ذرا بھی پروا نہیں ہے' اس لئے کہ وہ

اپنا رب ان ہی ہستیوں کو قرار دے چکے ہیں۔ دیکھ لیجئے کہ بزرگوں کے مزارات پر حاضری میں کبھی کوتاہی نہیں ہوگی' ان کے عرس کے مواقع پر خالص اشیاء نذرانہ کے طور پر پیش ہوں گی' لیکن باقی پورا سال اللہ کے مقرر کردہ حرام و حلال کی پروا کی جائے گی اور نہ ہی اس کے آگے سربہ سجود ہونے کی۔ وہ زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے' غریبوں اور مسکینوں کی بدحالی پر کبھی ان کا دل نہیں پسیجے گا' رشوت خوری یا ملاوٹ' اور ناجائز منافع خوری کی انہیں کبھی پروا نہیں ہوگی' اس لئے کہ یہ چیزیں تو اس اللہ نے حرام قرار دی ہیں جس کی نافرمانی کا انہیں کوئی خوف نہیں ہے۔

اب آیئے تیسرے طبقہ کی طرف' یہ وہ لوگ ہیں جو واقعی اللہ تعالیٰ کو ہی اپنا رب مانتے ہیں لیکن ان کے ہاں عبادت کا تصور یا تو محدود ہو گیا ہے یا مسخ شدہ ہے۔ ان لوگوں نے مراسم عبودیت اور اسلام کے ارکان ہی کو پوری عبادت سمجھ لیا ہے' باقی رہے تمدن' معاشرت' معیشت اور سیاست کے معاملات تو یہ ان کی نظر میں دنیاوی معاملات ہیں' جن کا عبادت سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمارے مذہبی طبقات جو مختلف مسالک سے وابستہ ہیں اکثر و بیشتر اسی نظریہ کے حامل ہیں۔ اگرچہ زبانی طور پر تو وہ کہتے ہیں کہ دین زندگی کے تمام معاملات میں رہنمائی دیتا ہے' لیکن عبادت کے لفظ کو انہوں نے صرف ارکان اسلام کے لئے خاص کر لیا ہے۔ اس دائرے میں وہ ذرا سی کوتاہی یا اختلاف کو برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں' لیکن زندگی کے باقی تمام معاملات میں ہر کسی سے اتحاد کرنے پر تیار ہوتے ہیں' خواہ وہ اسلام کو بطور دین مانے یا نہ مانے۔ گویا انہوں نے اسلام کو محض ایک مذہب کا درجہ دے کر اسے ہی کل دین سمجھ لیا ہے۔ ان کی مساجد' طریقہ نماز' مسائل روزہ و زکوٰۃ و حج تو مختلف ہیں لیکن طرز معاشرت' کاروبار اور طریق سیاست سب ایک جیسے ہیں' اور ان معاملات میں ان کا طرز عمل بالعموم اسلام کے مطابق نہیں ہے۔ ان کی تبلیغ اور بحث و مباحثے کی حدود بس مراسم عبودیت تک محدود ہیں۔ باقی رہا نظام معاشرت و معیشت و سیاست تو وہ خواہ مشرکانہ یا ملحدانہ ہو انہیں اس کی اتنی تشویش نہیں ہے جتنی اپنے مسالک میں اختلاف کی۔ ان کے مدرسوں اور مساجد پر حکومت کنٹرول کرنے کی کوشش کرے تو مرنے پر تیار ہوں گے لیکن طرز حکومت مغربی جمہوریت پر مبنی ہو'

معیشت سودی نظام پر مبنی ہو' معاشرے میں بے حیائی اور بے حجابی کا دور دورہ ہو تو انہیں کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ جان لیجئے کہ مراسم عبودیت' ارکان یا ستون ہیں جن پر اسلام کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ لیکن یہ ستون بجائے خود عمارت نہیں ہیں۔ اسلام کی عمارت تو اصل میں پوری زندگی میں اللہ کو رب مان کر اس کی فرمانبرداری اور اطاعت کا نام ہے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات کو انسان کے لئے پیدا کیا ہے تا کہ ان تمام اشیاء کو کام میں لائے لیکن میری بندگی میں رہ کر' یعنی اس کا ایمان و عقیدہ' اس کے مراسم عبودیت' رسومات' طرز معاشرت' کاروبار و معاش اور سیاست اللہ کے عطا کردہ نظامِ عدل و قسط کے تقاضوں کے تحت ہو' اور وہ پوری زندگی میں اسی کو رب مان کر اس کی اطاعت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نویدِ خلافت دی ہے وہاں اس خلافت کی اصل غرض و غایت بھی اس عبادت کو قرار دیا ہے :

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِي لَا يُشْرِكُوْنَ بِي شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ ﴾

(النور : ۵۵)

"اللہ تعالیٰ کا تم میں سے ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کر دینے والوں سے وعدہ ہے کہ وہ ان کو زمین میں لازماً خلافت عطا کرے گا' جیسے اس نے خلافت عطا کی ان سے پہلوں کو۔ اور وہ ان کے اس دین (نظام بندگی) کو غلبہ عطا کرے گا جو اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے' اور ان کے خوف کو امن میں بدل دے گا۔ وہ میری ہی بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور جو اس کے بعد بھی کفر کریں تو وہی نافرمان ہیں"۔

اللہ تعالیٰ اسی مقصد کے لئے اپنے رسولوں کو مبعوث فرماتا رہا ہے کہ وہ اس نظامِ

عدلِ اجتماعی کو قائم کریں جس کی بدولت اللہ کی فرمانبرداری کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ یہ ہے وہ حق مالک ارض و سماء کا جو بحیثیت انسان ہم میں سے ہر ایک پر عائد ہوتا ہے۔ وہی مالک حقیقی ہے اور اسی کے ہاتھ میں ہر جاندار کا رزق اور اس کی زندگی کا اختیار ہے' اور یہی ہے فرمان نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کہ اللہ کا بندوں پر صرف یہی حق ہے کہ وہ اس کی بندگی کریں اور اس میں کسی کو شریک نہ کریں۔ اگر وہ یہ کر گزریں تو پھر بندوں کا یہ حق ہے کہ ان کا رب انہیں عذاب نہ دے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین ○○

اہم اطلاع

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا الیکٹرانک میل کا پتہ تبدیل ہو گیا ہے۔ رابطے کے لئے نئے پتے درج ذیل ہیں :

anjuman@brain.net.pk
afzaal@academy.edunet.sdnpk.undp.org

ضرورت رشتہ

اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی ایک دینی مزاج رکھنے والی تعلیم یافتہ' باپردہ لڑکی کے لئے جس نے بی ایس سی کے بعد ایک سال دینی تعلیم کے حصول پر بھی صرف کیا ہے' دینی تحریکی مزاج رکھنے کے حامل' مالی طور پر مستحکم گھرانے سے رشتہ مطلوب ہے۔

برائے رابطہ : ع س۔ معرفت "میثاق" 36 کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 3-5869501

☆ ☆ ☆

تنظیم اسلامی کے رفیق عمر ۳۳ سال' سرکاری ملازم (ایئر فورس) عقد ثانی کے لئے باعمل حافظہ قرآن' کنواری' مطلقہ یا بیوہ کا رشتہ درکار ہے۔

برائے رابطہ : صفدر علی اعوان (م۔ی) 36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 3-5869501

بحث و نظر

جہاد کشمیر کی حقیقت
جہاد فی سبیل اللہ یا جہادِ حریت؟

انجینئر نوید احمد' کراچی

لفظ جہاد کا مادہ ہے ج ھ د۔ اسی مادہ سے "جہد" بنا ہے جس کے معنی کوشش کے ہیں۔ ایک کوشش کے دوسری کوشش کے ساتھ ٹکرانے کے عمل کو جہاد کہا جاتا ہے۔ گویا جہاد سے مراد ہے کشمکش یا کشاکش۔ باطل کے خلاف ایسی کشمکش جس کا مقصد اللہ کے کلمہ کی سر بلندی یعنی اللہ کی بڑائی کا نفاذ ہو جہاد فی سبیل اللہ کہلاتی ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کے مراحل

جہاد فی سبیل اللہ کے تین مراحل ہیں :

(۱) باطن میں نفسانی خواہشات کے خلاف جہاد کرنا اور اس کے نتیجہ میں اپنی ذاتی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی کلی اطاعت کا پابند کرنا۔

(۲) خارج میں باطل نظریات اور دین اسلام کے نام پر محدود و مسخ شدہ مذہبی تصورات کے خلاف دلائل اور پر سوز وعظ و نصیحت کے ذریعے قولی و تحریری یعنی زبان و قلم سے جہاد کرنا۔

(۳) مطلوبہ قوت کی فراہمی پر باطل نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر' اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے میدان میں نکل کر مسلح جدوجہد کرنا۔ اس مرحلہ پر جہاد فی سبیل اللہ' دراصل قتال فی سبیل اللہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

قتال فی سبیل اللہ کے لئے شرائط

قرآن و حدیث اور سیرت طیبہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قتال فی سبیل اللہ

یعنی باطل نظام کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کرنے کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کا پورا کرنا لازمی ہے :

(۱) مسلح جدوجہد میں شریک ہونے والے افراد اپنے اپنے نفس کے خلاف جہاد کرتے ہوئے معاشرہ میں سیرت و کردار کا لوہا منوا چکے ہوں۔

(۲) مسلح جدوجہد کے آغاز سے قبل قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں پوری ہمدردی' دلسوزی اور خلوص کے ساتھ دین اسلام کی عادلانہ اور آفاقی تعلیمات معاشرہ کے مختلف طبقات کے سامنے پیش کر دی گئی ہوں۔ غلط فہمیوں' اشکالات اور اعتراضات کا مدلل جواب دے کر اتمام حجت کا حق ادا کر دیا گیا ہو۔

(۳) مسلح جدوجہد کا آغاز کرنے والے افراد ایک قائد کی قیادت میں پوری طرح سے متحد و منظم ہوں اور ان افراد نے نظم کے خوگر ہونے کا یعنی مستقل مزاجی سے سننے اور ماننے کی روش کا مظاہرہ کر دیا ہو۔

(۴) مسلح جدوجہد کے آغاز سے قبل اپنی قوت کا درست اندازہ کر لیا گیا' ہو یعنی اس بات کو یقینی بنا لیا گیا ہو کہ افرادی قوت' جوش و جذبہ اور جنگی وسائل و اسباب کے بل بوتے پر باطل نظام کے محافظوں کو میدان جنگ میں شکست دی جا سکتی ہے۔

اہم بات

متذکرہ بالا چار شرائط میں سے آخری شرط کے بارے میں یہ بات بڑی اہم ہے کہ آج کے دور میں عوام الناس کے لئے ممکن نہیں رہا کہ وہ باطل نظام کی محافظ تربیت یافتہ اور جدید اسلحہ سے لیس افواج کا مسلح جدوجہد کے ذریعے مقابلہ کر سکیں۔ آج ہر ملک میں ایسی ہمہ وقت افواج ملک میں رائج نظام کی حفاظت پر مامور ہیں جو اعلیٰ جنگی مہارت بھی رکھتی ہیں اور بری' بحری اور فضائی جنگ کے لئے جدید ہتھیاروں سے بھی مسلح ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ حالات میں دنیا کے کسی خطے میں بھی کوئی ایسی کوشش کامیاب نہ ہو سکی جس میں ملکی افواج کا مقابلہ ہتھیاروں سے کرنے کی کوشش کی گئی۔

متبادل طریقہ کار یہ ہے کہ جوں ہی یہ اندازہ ہو جائے کہ ایمانی کیفیات' جوش و جذبہ'

نظم و ضبط اور افرادی قوت کے اعتبار سے باطل نظام کو چھیڑنے کی صلاحیت فراہم ہو گئی ہے' تو پر امن اور منظم احتجاج کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ اس احتجاج میں سول نافرمانی اور اہم شاہراہوں اور حکومتی اداروں کا پر امن (یعنی توڑ پھوڑ اور جلاؤ سے پاک) گھیراؤ شامل ہو گا۔ ۱۹۸۰ء میں اہل تشیع نے اسی طرح کے احتجاج کے ذریعے پاکستان کی مارشل لاء حکومت سے زکوۃ آرڈیننس میں ترمیم کروالی تھی۔

جہاد کشمیر

مندرجہ بالا گفتگو کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر میں جہاد کشمیر کے نام سے جو مسلح جدوجہد کی جارہی ہے اس میں وہ شرائط پوری نہیں کی گئیں جو ایسی جدوجہد کے لئے درکار ہیں اور اسی وجہ سے یہ جدوجہد "جہاد فی سبیل اللہ" قرار نہیں دی جاسکتی۔ جہاد کشمیر کے بارے میں ہمارے اس موقف کی بنیاد مندرجہ ذیل دلائل پر ہے :

پہلی دلیل : کشمیر میں ہندوستان' مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک کر رہا ہے جو مکی دور میں مشرکین نے اہل ایمان کے ساتھ روا رکھا تھا۔ البتہ ہم مسلمانوں نے اپنے سیرت و کردار کا وہ نقشہ پیش نہیں کیا جو مکی دور میں اہل ایمان نے مشرکین کے سامنے پیش کیا تھا۔ گویا جہاد فی سبیل اللہ کی پہلی منزل یعنی نفس کے خلاف جہاد کی مثالی تصویر پیش کرنے سے ہم قاصر رہے ہیں۔ لوٹ کھسوٹ' دھوکہ دہی' جھوٹ' ملاوٹ' بے حیائی' فحاشی وغیرہ میں ہم نے بہت سے غیر مسلموں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یہ بات مضحکہ خیز ہے کہ ہم اپنی ذات' اپنے گھر اور اپنے دائرہ کار میں تو اللہ کی بڑائی نافذ نہ کریں جبکہ کشمیر میں اس مقصد کے لئے جہاد کرنے لگ جائیں۔

دوسری دلیل : یہ بات نوع انسانی پر ظلم کے مترادف ہو گی کہ اس کے سامنے دین اسلام کا صحیح تصور پوری دلسوزی اور ہمدردی کے ساتھ اور تمام تعصبات سے بالاتر ہو کر پیش کئے بغیر ہی اس کے خلاف ہتھیار اٹھالئے جائیں۔ ہم نے ہندوستان کے باشندوں کے سامنے دین اسلام کو اکثر و بیشتر ایک حریف دین کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ قرآن حکیم کی پر حکمت اور اثر انگیز تعلیمات سے تو آج مسلمانوں کی اکثریت بھی لاعلم ہے کجا یہ کہ انہیں غیر

مسلمانوں کے سامنے پیش کیا گیا ہو۔ تبلیغ اور عمل کے ذریعے اتمام حجت کئے بغیر' غیر مسلموں کے خلاف ہتھیار اٹھانا ہرگز جہاد فی سبیل اللہ کے زمرے میں نہیں آتا۔

تیسری دلیل : ہم نے آج سے تقریباً پچاس برس قبل پاکستان اور کشمیر کا کچھ علاقہ یعنی آزاد کشمیر حاصل کیا۔ ان علاقوں میں ہم نے آج تک اللہ کی بڑائی یعنی دین اسلام کا نفاذ نہیں کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہم مقبوضہ کشمیر کو بھارت سے کیوں آزاد کروانا چاہتے ہیں۔ اگر وہاں اسلام کا نفاذ مقصود ہے جو کہ جہاد فی سبیل اللہ کی اصل غرض و غایت ہے تو پہلے یہ سعادت پاکستان اور آزاد کشمیر میں حاصل کرنا ہوگی' ورنہ ہمیں صاف اعتراف کرنا ہوگا کہ ہمارا جہاد نفاذ اسلام کے لئے نہیں بلکہ نسلی مسلمانوں کو ہندوستان سے آزادی دلانے کے لئے ہے۔ گویا ہم "جہاد فی سبیل" اللہ نہیں بلکہ "جہاد حریت" کر رہے ہیں۔

چوتھی دلیل : مسلح جدوجہد اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جبکہ یہ ایک جھنڈے تلے اور ایک قائد کی قیادت میں ہو۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر وہی کچھ ہونے کا اندیشہ ہے جو کچھ کہ افغانستان میں روس کے جانے کے بعد ہوا۔ افغانستان کے جہاد کی طرح' کشمیر کے جہاد میں بھی کئی جماعتیں الگ الگ برسرپیکار ہیں۔ اگر یہ جہاد رضائے الٰہی کے لئے ہو رہا ہے تو مل بیٹھ کر ایک قیادت پر متحد و متفق ہونا ہوگا' ورنہ اگر صورت حال افغانستان جیسی ہو گئی تو باہم جنگ و جدال کی ذمہ داری ہمارے کندھوں پر ہوگی اور مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کا بہنے والا خون ہماری گردن پر ہوگا۔

پانچویں دلیل : نبی اکرم ﷺ کی سیرت سے ہمیں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ امکانی حد تک اپنی جان کی حفاظت کرتے ہوئے' سیرت و کردار کے مثالی نمونے اور دعوت و تبلیغ کے ذریعے باطل کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جائے۔ شوق شہادت کی بنیاد پر یہ عمل درست نہیں کہ بغیر سوچے سمجھے اور جذبات کی رو میں بہہ کر دشمن کے سامنے آجایا جائے اور جان دے دی جائے۔ ایسا کرنے سے تو دشمن ہی کو فائدہ حاصل ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ سن ۱۰/ نبوی میں جب طائف سے مکہ واپس آئے تو سرداران قریش آپؐ کو شہید کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ آپؐ نے ایک مشرک سردار مطعم بن عدی کی پناہ میں زندہ رہ کر

دشمن کے خلاف جدوجہد جاری رکھنے کو اس بات پر ترجیح دی کہ مشرکین کے سامنے جا کھڑے ہوں اور وہ آپؐ کی جان لے لیں۔ (بدر کی شب آپ ﷺ نے اپنے لئے تیار کردہ جھونپڑی کے گرد پہرہ کا انتظام کروایا اور میدان احد میں ۹ صحابہؓ آپؐ کی حفاظت پر مامور تھے)۔ مکی دور میں صحابہ کرامؓ نے ہر ظلم و ستم کو خاموشی سے برداشت کیا لیکن کوئی جوابی کارروائی تو درکنار مدافعت میں ہاتھ تک نہ اٹھایا۔ اگر ظلم و ستم کا جواب اسی انداز میں دیا جاتا تو مشرکین تمام صحابہ کو شہید کر دیتے اور غلبہ اسلام کی تحریک بالکل ابتداء ہی میں دم توڑ دیتی۔ جہاد فی سبیل اللہ کے ابتدائی مراحل طے کئے بغیر اور دشمن کی قوت و طاقت کا اندازہ لگائے بغیر' لوگوں کے جذبات انگیخت کر کے ان کی جانیں قربان کروانا' دراصل دین کے ساتھ نادان دوست کا سا کردار ادا کرنا ہو گا۔

چھٹی دلیل: جہاد کشمیر کے لئے لوگوں کو تیار کرنے اور ان سے عطیات حاصل کرنے کے لئے سورۃ النساء کی آیت ۷۵ کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے جس میں فرمایا گیا:

﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ۝﴾

"اور تم کو کیا ہوا ہے کہ نہیں لڑتے اللہ کی راہ میں اور ان کے واسطے جو مغلوب ہیں مردوں' عورتوں اور بچوں میں سے' جو کہتے ہیں اے رب ہمارے نکال ہم کو اس بستی میں سے کہ ظالم ہیں یہاں کے رہنے والے اور کر دے ہمارے واسطے اپنے پاس سے کوئی حمایتی اور کر دے ہمارے واسطے اپنے پاس سے کوئی مددگار"۔

یہ آیت مدنی دور میں نازل ہوئی اور اس میں ان مظلوم اہل ایمان کا ذکر ہے جو مکہ میں مشرکین کے رحم و کرم پر تھے۔ صحابہ کرام پر زور دیا گیا کہ وہ ان مظلومین کی مدد کے لئے اللہ کی راہ میں مشرکین مکہ سے جنگ کریں۔ البتہ اس آیت میں قتال کا جو حکم دیا گیا ہے' اس کا اطلاق مسلمانانِ پاکستان پر دو وجوہات کی بنیاد پر نہیں ہوتا:

(i) سورۃ الانفال کی آیت ۷۲ میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ دشمن کے علاقے میں

محصور مسلمانوں کی مدد تم پر لازم ہے۔ البتہ اگر دشمن سے تمہارا کوئی معاہدہ ہے تو پھر اس کی اجازت نہیں۔ اگر دشمن کی طرف سے معاہدہ کی خلاف ورزی ہو تو پھر اسی سورۃ کی آیت ۵۸ میں کہا گیا کہ علی الاعلان معاہدہ توڑو اور پھر کوئی کارروائی کرو۔ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم نے ہندوستان کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر رکھے ہیں اور ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا معاہدہ کیا ہوا ہے۔ دونوں ممالک ایک دوسرے کے ساتھ تجارتی روابط بڑھانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ دونوں ممالک کے مابین نہ صرف مختلف کھیلوں کے مقابلے ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات بڑے بڑے ٹورنامنٹ دونوں ممالک مشترکہ طور پر منعقد کرتے ہیں۔ پھر حکومت پاکستان بار بار یہ اعلان کرتی ہے کہ ہم کشمیری مجاہدین کی کوئی مدد نہیں کر رہے۔ "بغل میں چھری اور منہ پر رام رام" کا طعنہ ہم ہندو مذہب کے پیروکاروں کو دیتے ہیں لیکن عملاً یہ روش ہم نے خود اختیار کر رکھی ہے۔ ایسی روش کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ سورۃ الانفال کی آیت ۷۲ ہی کو دلیل بناتے ہوئے ۱۹۴۹ء میں مولانا مودودی مرحوم نے جہاد کشمیر کو غلط قرار دیا تھا اور یہ موقف پیش کیا تھا کہ پہلے اپنے ملک میں اسلام نافذ کیا جائے اور پھر ہندوستان سے معاہدہ توڑ کر کھلم کھلا اعلان جنگ کر کے کشمیر میں جہاد کیا جائے۔

(ii) سورۃ النساء کا حکم ان مسلمانوں کے لئے ہے جو اہل مکہ پر قول و عمل کے ذریعے اتمام حجت کر چکے تھے اور اپنے دائرۂ کار میں یعنی مدینہ کی چھوٹی سی ریاست کی حد تک اس وقت تک نازل شدہ شریعت کے احکامات نافذ کر چکے تھے۔ مسلمانان پاکستان کے لئے اس حکم کا اطلاق کرنا ہرگز درست نہیں۔

بعض حضرات جہاد کشمیر کے لئے قرآن حکیم سے قتال فی سبیل اللہ کے بارے میں وہ آیات بیان کرتے ہیں جو مدنی دور میں نازل ہوئیں۔ ایسے حضرات اپنے سامعین و قارئین کو مدنی دور میں لے جانا چاہتے ہیں لیکن مکی دور کے جاں گسل مرحلے سے گزارنے کے لئے تیار نہیں۔ بقول اکبر الٰہ آبادی۔

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غار حرا پہلے

ساتویں دلیل: موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ شاید ہم غیر شعوری طور پر جہاد کشمیر کے ذریعے امریکی عزائم کی تکمیل میں حصہ لے رہے ہیں اور نیو ورلڈ آرڈر کے نفاذ کے لئے راہ ہموار کر رہے ہیں۔ مسئلہ کشمیر لگ بھگ ۵۰ سال پرانا ہے لیکن اس وقت امریکہ کی اس معاملہ میں دلچسپی معنی خیز ہے۔ امریکی عزائم میں یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں کہ کشمیر کو آزاد کروا کر وہاں ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کی جائے اور چین' ایران' ہندوستان اور وسطی ایشیا کے ممالک پر براہ راست نگاہ رکھی جائے۔ گویا ایشیا کے قلب میں ایک نیا "اسرائیل" قائم کرنا امریکہ کے پیش نظر ہے۔ اس اعتبار سے ہمیں جہاد کشمیر کے بارے میں اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔ امریکہ چاہتا ہے کہ یہ جہاد جاری رہے تاکہ ہندوستان کو مجبور کیا جا سکے کہ وہ امریکہ کو ثالث تسلیم کرے اور پھر امریکہ اپنے منصوبہ پر عمل کر سکے۔

جہاد کشمیر کی اصل نوعیت

مندرجہ بالا گفتگو کی روشنی میں ہم جہاد کشمیر کے نام سے کی جانے والی مسلح جدوجہد کو جہاد فی سبیل اللہ تو نہیں کہہ سکتے' البتہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے امید رکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے خلوص و اخلاص کے ساتھ اس کی رضا کے حصول کے لئے اس جہاد میں جانیں دیں' تکالیف اٹھائیں یا کسی بھی شکل میں قربانی دی' وہ انہیں اس کا بھرپور بدلہ عطا کرے گا۔

جہاد کشمیر کی نوعیت کا جہاں تک تعلق ہے تو اسے جہاد حریت کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے دین میں ایسے جہاد کو بھی نہ صرف جائز بلکہ پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک حدیث مبارک کا مفہوم ہے کہ جو شخص اپنے مال یا جان کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے وہ بھی شہید قرار پائے گا۔ اسی طرح اپنی آزادی' خود مختاری اور حقوق کے حصول یا تحفظ کے لئے جدوجہد قطعاً غیر اسلامی نہیں۔

مسئلہ کشمیر کا حل

بلاشبہ کشمیر سمیت پوری دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم و زیادتی ہو رہی ہے اس کا

حل جہاد فی سبیل اللہ کی آخری اور بلند تر شکل یعنی قتال فی سبیل اللہ ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم نے قتال فی سبیل اللہ کے آغاز کے لئے لازمی شرائط پوری کرنے کی طرف کوئی قابل ذکر پیش قدمی نہیں کی' لہٰذا ہمیں کوئی اور حل تلاش کرنا ہوگا۔ پھر ہمارے سیرت و کردار اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ ہمارے پاس وہ ایمانی قوت نہیں ہے جس کی بنیاد پر اپنے سے کئی گنا بڑے اور کہیں زیادہ وسائل رکھنے والے دشمن کو شکست دی جاسکے۔ لہٰذا ہمیں مسئلہ کے فوری حل کے لئے صلح و مصالحت کا طریقہ کار اختیار کرنا ہوگا۔

مسئلہ کا فوری حل

مسئلہ کشمیر کے فوری حل کے لئے ہمیں دو کام کرنا ہوں گے :

(۱) رائے عامہ کو تیار کیا جائے کہ وہ حکومت پاکستان پر دباؤ ڈالے کہ وہ امریکہ کو ثالث بنائے بغیر بھارت سے مسئلہ کشمیر پر براہ راست مذاکرات کرے۔ ان مذاکرات کے دوران بھارت کو اس حقیقت کا ادراک کرایا جائے کہ نیو ورلڈ آرڈر کے پردے میں نہایت قلیل نسلی اقلیت یعنی یہودی پوری دنیا پر ایک نیا مالیاتی استعمار مسلط کرنا چاہتی ہے۔ اس کا راستہ روکنے کے لئے ہمیں کشمیر کے مسئلہ کو تقسیم ہند کے فارمولے کے تحت حل کر لینا چاہئے۔ آزاد کشمیر' ہنزہ' گلگت' بلتستان وغیرہ کے مسلم اکثریتی علاقے پاکستان میں ضم کر دیئے جائیں اور لداخ و جموں کا ہندو اکثریتی علاقہ ہندوستان میں ضم کر دیا جائے۔ وادی کشمیر اور جموں کے مسلم اکثریتی علاقہ کو یہ آپشن دیا جائے کہ وہ چاہیں تو پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیں یا ہندوستان کے ساتھ الحاق کر لیں یا اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھیں۔

(۲) حکومت پاکستان پر رائے عامہ کے ذریعے دباؤ ڈالا جائے کہ وہ پاکستان' افغانستان' ایران اور روسی ترکستان پر مشتمل ایک مسلم بلاک کی تشکیل کی کوشش کرے اور یہ بلاک نیو ورلڈ آرڈر کا راستہ روکنے کے لئے ہندوستان اور چین کے ساتھ نہایت دوستانہ اور خوشگوار تعلقات استوار کرے۔

مسئلہ کا اصل حل

مسئلہ کشمیر سمیت پوری دنیا میں امت مسلمہ کے جملہ مسائل کے حل کے لئے ہمیں مندرجہ ذیل طریقہ کار پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔

(۱) مذہبی اور دینی تحریکیں اپنے کارکنان کو قرآن حکیم کے سیکھنے اور سکھانے کی اہمیت سے روشناس کریں تاکہ وہ اپنی محنتیں اور توانائیاں اس کام میں لگا کر امت مسلمہ میں قرآن حکیم کے ذریعے تجدید ایمان کی تحریک برپا کر سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں اور خصوصاً ہمارے پڑوسی ملک یعنی ہندوستان کے باشندوں کے سامنے قرآن حکیم کی آفاقی تعلیمات دلسوزی وہمدردی اور تعصب سے بالاتر ہو کر پیش کی جا سکیں۔

(۲) قرآن حکیم کے سیکھنے اور سکھانے کی اس تحریک سے ہمارے دلوں میں نہ صرف نور ایمان پیدا ہوگا بلکہ یہ مسلسل ترقی کرتا چلا جائے گا۔ اس کے نتیجہ میں ہمارے اندر جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ ایک صحیح روح کے ساتھ بیدار ہوگا اور ہم اس جہاد کا آغاز سب سے پہلے اپنے نفس امارہ کے خلاف کریں گے۔ ذاتی طور پر سیرت و کردار کی اصلاح کے ساتھ ساتھ یہ جہاد اپنے گھر میں ہوگا اور وہاں اللہ کے دین کا نفاذ ہوگا۔ ان شاء اللہ پھر ایک منظم اور پرامن تحریک کے ذریعے ہم یہ سعادت اپنے ملک کے لئے حاصل کرلیں گے۔ اگر ہم نے قرآن حکیم کی پرتاثیر دعوت کو پھیلانے کا حق ادا کر دیا اور دنیا کے سامنے عدل وانصاف کی پیکر ایک جدید اسلامی فلاحی ریاست کا نقشہ پیش کر دیا تو انسانیت آپ سے آپ دین اسلام کی طرف کھنچتی چلی آئے گی اور پورے کرہ ارضی پر نظام خلافت کے قیام کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ اور اس طرح اقبال کا یہ خواب ان شاء اللہ ضرور پورا ہوگا کہ۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے

افکار و آراء

حقانی صاحب‘ اپنی ذمہ داریاں ادا کریں!

نگران وفاقی وزیر اطلاعات و فروغ ابلاغیات ارشاد احمد حقانی کے نام

رفیق تنظیم اسلامی محبوب الحق عاجز کا کھلا خط

محترم ارشاد احمد حقانی صاحب وفاقی وزیر اطلاعات و فروغ ابلاغیات

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ۔ امید ہے کہ آپ ایمان و یقین کے بہترین حالات میں ہوں گے۔ راقم الحروف روزنامہ ”جنگ“ میں آپ کے کالموں کے حوالے سے آپ سے متعارف ہے۔ میرا تعلق بھی میدان صحافت سے ہے لیکن بس واجبی سا کہ کبھی کبھار معاشرتی مسائل اور سیاست حاضرہ پر کچھ نہ کچھ لکھ لیتا ہوں۔

حقانی صاحب! حدیث رسول ﷺ میں دین کو نصح و خیر خواہی کا نام دیا گیا ہے۔ یہ خیر خواہی جہاں اللہ تعالیٰ‘ اس کے رسولؐ اور عام مسلمانوں کے لئے ہے‘ وہاں اس کے مستحق ”اولوالامر“ بھی ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کو احکامات الٰہی پر عمل پیرا ہونے اور ان کے نافذ کرنے کی تلقین کریں۔ اسی حوالے سے اصلاح احوال کی غرض سے اس سے قبل بارہا ارباب اقتدار کو تذکیر و یاد دہانی کی خواہش پیدا ہوئی لیکن کبھی کسی سے رابطہ نہیں کیا۔ کیونکہ کرسی نشین ذاتی مفادات‘ لوٹ کھسوٹ اور اقتدار بچانے کی فکر سے بالاتر ملک و قوم کے وسیع تر مفاد کے لئے پیش کردہ تجویز یا تجاویز کو درخور اعتناء سمجھتے ہیں اور نہ کسی آدرش اور اعلیٰ نصب العین سے انہیں کوئی دلچسپی ہے بلکہ ہمارا سیاسی کلچر ہی یہ بن چکا ہے کہ ؎

کوئی مست ہے کوئی تشنہ لب تو کسی کے ہاتھ میں جام ہے
بھلا کوئی اس کا کرے بھی کیا یہ تو میکدے کا نظام ہے

لیکن آپ کی خدمت میں میڈیا کے حوالے سے چند معروضات اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ آپ سے خیر کی توقع اور دین و ملت کی بھلائی کی امید ہے‘ کیونکہ اولاً : آپ روایتی سیاستدان نہیں ہیں بلکہ اس میدان صحافت سے تعلق رکھتے ہیں جو لوٹ کھسوٹ کی بجائے خبر رسانی اور عوام اور حکمرانوں دونوں کو فکری رہنمائی کا مقدس فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ ثانیاً : میدان صحافت میں بھی آپ کی سوچ و فکر اسلام کے ہمہ گیر نظریہ کی ترجمان دکھائی دیتی ہے۔

حقانی صاحب‘ یوں تو ہمارا پورا سیاسی نظام ہی اہل پاکستان پر ستم ڈھا رہا ہے لیکن ذرائع ابلاغ بالخصوص ٹیلی ویژن پروگرام پوری قوم کے لئے سوہان روح بنے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس پہلو سے چند چیزوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

پہلی بات یہ کہ آج صحافت کو مختلف مسائل درپیش ہیں۔ ان مسائل میں سرفہرست صحافت کی آزادی کا مسئلہ ہے کیونکہ حکومتیں اخبارات کی سنسرشپ' پریس ایڈوائسز' سرکاری اشتہارات کی بندش' بلوں کی عدم ادائیگی یا نیوزپرنٹ کا مسئلہ کھڑا کر کے صحافت کی آزادی کو پامال کرتی ہیں۔ صحافتی میدان سے گہرے تعلق کی بنا پر آپ بھی یقیناً اس بات سے آگاہ ہوں گے کہ اخبارات' رسائل و جرائد وغیرہ کے مسائل کیا ہیں اور آزادی صحافت کو کیا خطرات درپیش ہیں۔ اس لئے اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اقتدار سے نوازا ہے آپ کے لئے ضروری ہے کہ صحافت کی آزادی اور بہتری اور صحافی برادری کو درپیش مسائل کے حل کے لئے مناسب اقدامات کریں اور حکومت اور پریس کے درمیان بہتر تعلقات کے فروغ میں فیصلہ کن کردار ادا کریں۔

دوسرے یہ کہ اخبارات میں شائع ہونے والا غیر اخلاقی مواد' کرائمز رپورٹوں کی بھرمار اور رنگین صفحات ہماری نوجوان نسل کے اخلاق و کردار پر نہایت برے اثرات مرتب کر رہے ہیں' لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اخبارات کو صحافتی ضابطہ اخلاق کا پابند بنایا جائے۔ خاص طور پر اخبارات میں فلمی اداکاراؤں پر مبنی رنگین صفحات کی اشاعت کو فی الفور ختم کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے صحافی تنظیموں' اخبارات کے مالکان اور مدیران کی خصوصی میٹنگ بلا کر غور و فکر کیا جائے تو زیادہ بہتر لائحہ عمل اور نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ ہماری ملکی تاریخ شاہد ہے کہ یہاں جو بھی پارٹی برسراقتدار آتی ہے وہ الیکٹرانک میڈیا پر قبضہ کر کے اسے "ذاتی جاگیر" بنالیتی ہے۔ ریڈیو' ٹی وی کی ایسی پالیسی وضع کی جاتی ہے جس کے تحت برسراقتدار جماعت کے حق میں ہی پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ اس کے معمولی ترقیاتی کاموں اور فلاحی منصوبوں کو بھرپور نمایاں کیا جاتا ہے۔ ٹی وی خبرنامہ میں ناظرین کے سامنے ملکی و ملی اور بین الاقوامی حالات و واقعات کی صحیح تصویر کشی کی بجائے صرف صدر' وزیراعظم' وزراء اور حکومتی ممبران اسمبلی کے اجلاس اور کارنر میٹنگز دکھائی جاتی ہیں۔ حزب اقتدار کے علاوہ دوسری سیاسی جماعتوں کو ٹی وی سے دور رکھا جاتا ہے اور ان کی کسی سیاسی سرگرمی کو کوریج نہیں دی جاتی۔ ٹی وی کی اس حکومت نواز پالیسی کا منفی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ٹی وی کے ذریعے فراہم کردہ خبروں اور اطلاعات پر سے عوام کا اعتماد اٹھ گیا ہے اور وہ بیرونی نشریات دیکھنے لگے ہیں۔ اب وقت کا اولین تقاضا ہے کہ "مقبوضہ" ٹی وی کو آزاد کیا جائے اور ایک ایسی مربوط' متوازن اور منصفانہ ٹی وی پالیسی وضع کی جائے جس کے زیر اثر تمام سیاسی جماعتوں کو ٹی وی پر یکساں کوریج دی جاسکے اور حالات و واقعات کی حقیقی تصویر عوام کے سامنے پیش کی جاسکے۔

چوتھے یہ کہ زمان و مکان کی تسخیر کی بدولت زمینی فاصلے سکڑ کر رہ گئے ہیں۔ پوری دنیا نے گلوبل ولیج کی شکل اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ اب جغرافیائی وحدتوں کی اہمیت کم ہوتی جارہی ہے اور قومیں وطن' زبان' رنگ اور نسل کی تنگ دامانیوں سے نکل کر سیاسی' معاشی' اور معاشرتی افکار کی وسیع تر وحدتوں کو اپنی تعمیر نو کی اساس بنارہی ہیں۔ اس کی نمایاں مثال یورپی یونین ہے۔ چنانچہ دوسروں کو شمشیر سے فتح کرنے کی بجائے نظریات کے میدان میں نیچا دکھانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ گویا عصر حاضر کی جنگ

شمشیر کی نہیں تہذیب کی جنگ ہے' ہتھیاروں کی نہیں نظریات کی جنگ ہے۔ نظریات اور تہذیبوں کی اس جنگ میں موثر ترین ہتھیار ٹیلی ویژن ہے' کیونکہ اس کے ذریعے نہایت موثر انداز میں نظریات کی تبلیغ کی جاسکتی ہے۔ اس مقصد کے لئے مختلف ممالک ڈش انٹینا کے ذریعے پوری دنیا میں اپنی نشریات دکھا رہے ہیں۔

نظریات کی اس جنگ میں مغربی طاقتیں زیادہ موثر کردار ادا کرتی اور غالب آتی نظر آرہی ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی نشریات بیرونی دنیا میں پیش کر رہی ہیں بلکہ انہوں نے دوسرے ملکوں میں بھی مقامی حکمرانوں کے توسط سے ٹی وی پر تسلط جما رکھا ہے' اور اسے اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے۔ اس حوالے سے ان کا خاص شکار مسلمان ممالک ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ مسلم ممالک سے انہیں ایسے فرماں بردار "غلام" میسر آگئے ہیں "جو آپ کا حکم سر آنکھوں پر" کی پالیسی اپنائے ہوئے ہیں۔ اہل مغرب کی بھرپور کوشش ہے کہ ٹی وی کے ذریعے اپنی زوال یافتہ' بے خدا' مادہ پرستانہ اور شرم وحیا سے عاری تہذیب کو مسلم معاشروں پر مسلط کر دیا جائے اور انہیں اپنی زندہ تہذیب اور تابندہ ثقافت سے بیگانہ کر دیا جائے' تاکہ جس طرح وہ خود اخلاقی اور معاشرتی میدانوں میں دیوالیہ ہو چکے ہیں اسی طرح مسلم ممالک میں بھی اباحیت اور جنسی بے راہ روی کو عام کر کے اہل اسلام کو اپنے دین سے بے زار اور معاشرتی و اخلاقی تباہی سے دوچار کر دیا جائے۔ ہمارا پاک وطن بھی اسی ناپاک سازش کا شکار ہو چکا ہے۔

ہمیں چاہئے تو یہ تھا کہ اپنے فلسفہ حیات اور بنیادی اصولوں اور نظریات کے مطابق انقلابی ٹی وی پالیسی تشکیل دیتے تاکہ ہم اپنی تابناک اور تابندہ تہذیب و ثقافت کو فروغ دے سکتے جو نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ تمام انسانیت کے لئے باعث رحمت اور اس کے اخلاقی امراض کی شفا ہے اور تاکہ ایک ایسی اعلیٰ سوسائٹی وجود میں آتی جو امانت و دیانت' سچائی و صداقت' اخوت و بھائی چارہ اور فکر و عمل کے میدان میں پوری دنیا کے لئے نظیر بن جاتی' لیکن ہم نے ایسا کرنے کی بجائے نظریاتی جنگ میں پسپائی اختیار کر لی اور اپنے اساسی نظریہ کو بالائے طاق رکھ کر بے خدا نظریات کو سینے سے لگایا اور مغربی کلچر کی تبلیغ کی۔ ٹی وی پر ایسے پروگرام پیش کئے جن کا ہماری تہذیب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا چنانچہ آج شرم و حیا' غیرت و حمیت اور عفت و عصمت کے تمام تقاضوں کو فراموش کر کے ٹی وی پر قوم کی ماؤں' بہنوں اور بیٹیوں کو عریاں لباس میں پیش کیا جارہا ہے۔ صنف نازک کے حسن و جمال اور جسمانی نشیب و فراز کی بھرپور نمائش کی جارہی ہے۔ عورت کو ماڈل گرل کے روپ میں پیش کیا جارہا ہے۔ روح فرسا ننگے ناچ' آزادانہ رقص و سرود' شرمناک گانوں اور بے ہنگم موسیقی کے پروگراموں سے نسل نو کی "تفریح" کا سامان کیا جارہا ہے۔ ڈراموں' فلموں اور دوسرے پروگراموں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان شرم سے عاری مکالمے نشر کئے جارہے ہیں۔

ان پروگراموں کو دیکھ کر کوئی ذی ہوش یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اسی سرزمین مقدس کی نشریات ہیں جس کی بنیادوں میں شہیدوں کا خون بہا ہے' جو اسلام کے مقدس نام پر حاصل کی گئی ہے' جس کے دستور میں خدائی حاکمیت کا اقرار و اعلان کیا گیا ہے' جس میں سیاسی مداری اپنی تمام تر منافقتوں اور خباثتوں کے

باوجود اسلام ہی کو اقتدار تک پہنچنے کا زینہ بناتے رہے ہیں بلکہ ان پروگراموں سے نمایاں تاثر یہ ملتا ہے کہ پاکستان صالح' نیک' باکردار' شریف اور غیرت مند افراد کا وطن نہیں بلکہ بھانڈوں' کنجروں' اداکاروں' جنس پرستوں' لوفروں اور لفنگوں کی سرزمین ہے۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہم نے پاکستان کے لئے بے شمار قربانیاں اس لئے دی تھیں کہ ہم آزادی کے بعد مغربی نظام' مغربی فکر و فلسفہ' مغربی اخلاقیات اور مغربی کلچر کو اختیار کر لیں۔ اگر ایسا ہی مقصود تھا تو پھر اس کے لئے علیحدہ وطن کی جدوجہد یکسر فضول اور بے معنی تھی۔ لیکن اگر ہماری جدوجہد کا مطمح نظر یہ تھا کہ ہم آزاد وطن میں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بسر کر سکیں' تو پھر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ خدارا نظریہ پاکستان' پاکستان کے لئے دی گئی قربانیوں' خدائے رحمان کی مہربانیوں' اہل وطن کی پریشانیوں اور اعدائے اسلام کی کارستانیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ٹی وی پالیسی پر نظر ثانی کر کے اسلامی اقدار کے مطابق ایک متوازن اور صاف ستھری پالیسی وضع کیجئے۔ یہ آپ کی آئینی ذمہ داری ہے اور دینی و اخلاقی فریضہ بھی۔ یہ کام اس لئے بھی ضروری ہے کہ آپ خود تہذیب حاضر سے نفرت کرتے' اسے مسلمانوں کی پریشانیوں کا اصل سبب گردانتے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد کو وقت کا اولین تقاضا قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک ماہ قبل ہی آپ نے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے

> "ترقی کا جو فلسفہ اعلیٰ اخلاقی قدروں سے عاری ہو وہ نام کے مسلمان کو بھی پریشان اور بے زار ہی رکھے گا۔ اگر آپ دور اندر تک کھوج لگانے کی کوشش کریں تو اس پریشانی اور بے زاری کی جڑیں مغربی ثقافت اور اس کی لادین آزادی میں پیوست ملیں گی..... وقت آ گیا ہے کہ مسلمان سیاسی آزادی کے حصول کے بعد ان تہذیبی' فکری اور معاشی بندھنوں کو توڑنے اور نظام جبریت سے ٹکرانے کے لئے اٹھیں"۔

(بحوالہ "عصر حاضر اور اسلام کا نظام معیشت" روزنامہ جنگ ۲ دسمبر ۹۶ء)

اگر آپ مغربی کلچر اور تہذیب کو بے خدا اور مادہ پرستانہ قرار دے کر اس کے خاتمے کی بات کرتے ہیں تو اس کے خاتمے میں نمایاں کردار آپ ہی ادا کر سکتے ہیں کیونکہ اللہ نے آپ کو طاقت دی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ آپ ٹی وی کا قبلہ درست کریں۔ اگر آپ ایسا کر لیتے ہیں تو اس پوری قوم کے مسیحا بن سکتے ہیں جو سیاسی حکومتوں' سماجی مجبوریوں اور معاشی ناانصافیوں کا شکار تو ہو ہی چکی' اب معاشرتی اور اخلاقی بحران سے دوچار ہو کر دیوالیہ پن کو پہنچنے والی ہے۔ لیکن اگر آپ نے ٹی وی کی موجودہ پالیسی کو برقرار رکھا تو پھر یہی سمجھا جائے گا کہ روایتی سیاسی طالع آزماؤں کی طرح آپ بھی محض بیان بازی اور کالم "بازی" پر ہی اکتفا کرنے کے قائل ہیں۔ عملاً آپ کو اسلامی کلچر سے دلچسپی ہے اور نہ محبت' کیونکہ یہ عجیب تضاد ہو گا کہ اپنے کالموں میں تو آپ اسلامی تہذیب کے راگ الاپتے رہیں لیکن طاقت میں آ کر کچھ نہ کریں۔ بقول جگر مراد آبادی ؎

یہ جناب شیخ کا فلسفہ بھی عجب ہے سارے جہان میں
جو وہاں پیو تو حلال ہے جو یہاں پیو تو حرام ہے

امید ہے کہ میری معروضات پر ہمدردانہ غور فرما کر عملی اقدامات کریں گے۔

DOGMAS اور RITUALS کے دھندلکوں سے نکل کر

علم کی روشنی میں مقصد زندگی کا فیصلہ کیجئے

اس مقصد سے ایک خط و کتابت کورس جاری کیا گیا ہے جو "اسلام کا جائزہ" نامی کتاب حصہ اول، دوم اور سوم پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں اسلام کے نظریات، حصہ دوم میں چند منتخب بنیادی تصورات (Concepts) اور حصہ سوم میں چند منتخب ذہنی الجھنوں کو دلائل سے واضح کیا گیا ہے، لیکن سادہ اور عام فہم انداز میں۔

کتب بذریعہ رجسٹری ارسال کی جائیں گی۔ مکمل کورس کی فیس ایک سو پچاس روپے (Rs. 150/-) ہے۔ اساتذہ، طلبہ اور طالبات کو فیس میں پچاس فیصد رعایت ہے۔ فیس میں مزید رعایت کی بھی گنجائش ہے۔

تفصیلات کے لئے پراسپکٹس طلب کریں۔

لطف الرحمٰن خان
ابلاغ فاؤنڈیشن
پوسٹ بکس نمبر 2360
لاہور

Meesaq
LAHORE

Reg. No. L 125
Vol. 46 No.1
Jan. —1997

شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا (البقرہ :۱۸۵)

ماہ رمضان المبارک کا خصوصی تحفہ

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبول عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

خود پڑھئے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفہ پیش کیجئے!

نوٹ

ماہ رمضان المبارک میں اس کتابچے کو بڑے پیمانے پر عام کرنے کے لئے اس کا ایک خصوصی سستا ایڈیشن تیار کیا گیا ہے جو لاگت سے بھی کم قیمت پر یعنی تین سو روپے فی سینکڑہ کے حساب سے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اور دوسرے شہروں میں قائم ذیلی انجمنوں کے دفاتر سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

شائع کردہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن